سلسلۂ مطبوعات کتاب خانۂ رامپور نمبر ۶

بزمِ سخن رامپور میں حصہ لینے والے شعراء کے چیدہ کلام اور مختصر حالاتِ زندگی کا مجموعہ

مرتبہ

ضمیر احمد ہاشمی

حسب الحکم

اعلیٰحضرت فرمانروائے رامپور دام اقبالہم وملکہم

۱۹۴۴ء

گیسوئے اردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیٔ دل سوزیٔ پروانہ ہے

مضامین

تقریب

ریاستِ عالیہ مصطفےٰ آباد (رام پور) ہمیشہ سے علم و ہنر کی سرپرستی کرتی رہی ہے۔ شاعروں میں سے اکثر نے اس کے والیوں کے دامنِ لطف و کرم میں پناہ لے کر اپنے فن کی آبیاری کی اور قائم مصحفی سے امیر و داغ تک اسی دربار کی قدردانی و قدر افزائی سے آسمانِ شہرت پر چمکے۔

اس خصوص میں نواب سید یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں ناظم تخلص اور نواب سید کلب علی خاں بہادر خلدِ آشیاں نواب تخلص کا عہد بہت ممتاز ہے۔ ان ادب پروروں نے خزاں دیدہ و ستم رسیدہ ہندوستان کے تمام علمی جواہر پارے اپنے دربار میں جمع کر لیے تھے، اور بے یار و مددگار اہلِ ادب کی خاطر خواہ دلجوئی و مدارات کی تھی۔ یہ دونوں خود عالم، ادیب اور شاعر تھے۔ اپنی شبانہ صحبتوں میں شعر و سخن کے لیے مناسب وقت نکال کر تفوق جویوں کو موقع دیتے تھے کہ اپنی مخفی ادبی صلاحیتوں کو بر روے کار لاکر اس فن کو شایانِ شان ترقی دیں۔ اس تفوق جوئی ہی کا یہ خوشگوار نتیجہ تھا کہ دبستان دہلی و لکھنؤ کے حامیوں کے دن رات کے ادبی تصادم سے شعر و سخن کا ایک

نیا اسلوب پیدا ہوگیا۔

نواب سید حامد علی خاں بہادر جنت مکاں رشک تخلص کے وسطِ عہد تک شعر و سخن کی پرورش کو ریاست کے مشاغل میں برابر جگہ حاصل رہی۔ اِس کے بعد جدید شاعری کے بڑھتے ہوئے ذوق نے شعر کو دربار سے باہر نکال کر عوام سے روشناس کرایا، تو بعض نئے رجحانات کے باعث شعر اور دربار کے تعلقات میں ایک گونہ مغایرت پیدا ہوگئی۔

ریاست رامپور نے بندگانِ ہمایونِ اعلحضرت دام اقبالہم وملکہم کے زیرِ سایہ جو نمایاں ترقی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

آغازِ عہدِ مبارک سے حضورِ انور کا یہ ایما رہا ہے کہ رامپور کے علمی نشاۃ ثانیہ کی طرف بھی عملی قدم اُٹھایا جائے۔ اہلِ رامپور نے اساتذۂ قدیم سے استفادے میں قابلِ قدر جوش اور ولولے کا ثبوت دیا تھا، جس کا خوش آیند نتیجہ عنبر شاہ خاں عنبر و آشفتہ میاں نظام شاہ نظام، صاحبزادہ سید عباس علی خاں بہادر بیتاب، محمود خاں محمود، احسان علی خاں احسان اور حکیم عبدالہادی خاں وفا کی شاعری ہے۔ موجودہ تعلیمی ترقی کے دور میں رامپور کے نوجوان طبقۂ شعرا سے زیادہ خوش آیند توقعات وابستہ تھیں۔ چنانچہ ایماے ہمایوں کی تعمیل میں ترقی خواہ کو مناسب معلوم ہوا کہ شعراے رامپور اور مستند بیرونی اساتذۂ شعر کے درمیان رابطۂ اتحاد و اعانت پیدا کرکے دبستانِ رامپور کی از سرِ نو آبیاری کی جائے۔

میرے رفقاے کار نے اس تجویز کو پسند کیا اور ایک ادبی

مجلس بزمِ سخن کے نام سے قائم ہوگی۔ اس بزم نے دو سال کے اندر رامپور میں متعدد یادگار معیاری مشاعرے منعقد کیے اور اس طرح نوجوانوں کی رہنمائیِ ذوق کا نیا باب کھول دیا۔ یہ مجلسیں اپنی نوعیت کی بے مثال صحبتیں تھیں، جن کی نہ صرف یاد شرکا کے دلوں میں تازیست باقی رہے گی، بلکہ نوجوان شاعروں پر ان کا اثر بھی پایدار اور دور رس مرتب ہوگا۔ بالخصوص اس بنا پر کہ اعلیٰحضرت اور علیا حضرت دام اقبالہم وملکہم نے اپنی شاہانہ توجہ اور پیہم نوازش سے ان جلسوں کے شرکا کو معزز فرمایا تھا۔

بزمِ سخن نے ان جلسوں کی رو داد کو زیادہ ہمہ گیر مفید اور دلچسپ بنانے کے خیال سے یہ بھی طے کیا تھا کہ آخر میں ایک ایسا مجموعہ شائع کیا جائے، جس میں شریکِ مشاعرہ اساتذہ کا چیدہ کلام، اور شبیہ اور عکسِ خط کے ساتھ مختصر حالات درج ہوں۔ زیرِ نظر کتاب وہی مجموعۂ کلام ہے، جسے سلسلۂ مطبوعاتِ کتاب خانۂ رامپور کے چھٹے نمبر کے بطور چھاپ کر حضورِ انور میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اس کی ترتیب و تالیف میں عالی مرتبت خان بہادر ضمیر احمد ہاشمی صاحب بہادر ڈپٹی ریو نیو منسٹر نے جس محنت اور کاوش سے کام کیا ہے وہ مستحقِ تحسین ہے۔ اگر انھیں بزمِ سخن کے مقاصد سے کما حقہٗ دلچسپی اور اُن کی تکمیل میں مناسب انہماک و شغف نہ ہوتا، تو موجودہ دورِ ابتلا میں بزم کی دو سالہ کارگزاری کا یہ خوش منظر نتیجہ کبھی نہ نکل سکتا۔

استدعا ہے کہ سابق کی طرح یہ ادبی سعی بھی بارگاہِ ہمایوں سے مشرف بقبول ہو، اور خدا سے دعا ہے کہ عہدِ مسعودِ رضائی ہر طرح کامیاب و بامراد ثابت ہو۔ آمین۔

بشیر حسین زیدی
چیف منسٹر

سکریٹریٹ رام پور
۷ر اکتوبر ۱۹۴۴ء

دیباچہ

دِلّی کے اقبال کا سورج گہن میں آیا اور یہاں کی بساطِ حکومت اُلٹی تو اُس کے مُہرے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ کچھ حیدر آباد اور بیشتر لکھنؤ پہنچے جہاں محفل ابھی گرم تھی اور نواب وزیر کی فیاضی اِن باکمال پردیسیوں کے زخم پر مرہم کا کام کر رہی تھی۔ خانِ آرزو، مرزا رفیع السودا، میر تقی میرؔ، میر سوزؔ، انشاء اللہ خاں انشاؔ اور قلندر بخش جرأتؔ اِنھیں باکمال پردیسیوں کے قافلہ سالار شمار کیے جاتے ہیں۔

زمانہ بدل رہا تھا۔ ملک میں نئی نئی قوتیں کار فرما تھیں۔ لفظوں کی چھریاں اور محاوروں کی جنگیں اِن کا مقابلہ نہ کر سکیں، اور لکھنؤ کی بہار میں بھی خزاں آگئی۔ شاعروں نے پھر اپنی اپنی بیاضیں بغل میں دابیں اور آسرے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ شمالی ہند میں صرف مصطفےٰ آباد رامپور کی سرکار قدردان نظر آئی، جس کا سایہ ہندستانی اقبال کے ڈھلتے ہوئے سورج میں دِلّی اور لکھنؤ تک پہنچ رہا تھا۔ اہلِ ادب کا یہ لٹا پٹا قافلہ ادھر چل پڑا۔ دربار نے اِن باکمالوں کو اپنے سایے میں جگہ دی اور جو محفل لکھنؤ سے برہم ہوئی تھی، وہ یہاں قائم ہوگئی۔

میرزا غالبؔ مرتے دم تک اسی دربار سے وابستہ رہے۔ داغؔ، امیرؔ، تسلیمؔ، جلالؔ کی شاعری یہیں پروان چڑھی۔ دربار نے اُن کو طرح طرح سے نوازا، اُنھوں نے شاعری کو رنگ رنگ سے سنوارا۔ آخرکار لکھنؤ اور دلّی کے اثر سے زبان اور منجھ گئی، روز مرّہ صاف ہوا اور اور اہلِ رامپور کے ادبی ذوق کی ایسی تربیت ہوئی کہ گو زمانے نے دیوانِ زندگی کے کئی ورق اُلٹ دیئے، مگر شعر کی گرمی اب بھی دلوں کو گرماتی ہے۔

مگر زمانے نے ایک اور کروٹ لی ہے۔ زندگی کی قدور بدل رہی ہیں، نظامِ معاشرت یکسر دوسرے نہج پر چل رہا ہے، زبان نئے خیالات اور نئے اسلوب سے مانوس ہو رہی ہے اور ادب کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اِن بدلتے ہوئے حالات میں گرد و پیش کا صحیح جائزہ لے کر زبان کے ماضی اور مستقبل کو ہم آہنگ بنانے کی ضرورت تھی۔ اِس خیال کے پیشِ نظر رامپور میں بزمِ سخن کا قیام عمل میں آیا، جو اِس بڑے کام میں رام پور کے خوش ذوق ادیبوں کی مدد کرنا چاہتی تھی۔

بزم نے پہلا عملی قدم اُٹھایا اور یہ طے کیا کہ ملک کے مشہور شعراء کو دو دو تین تین کرکے رام پور میں دعوت دیجائے کہ وہ یہاں تشریف لاکر بزم کے جلسے میں اپنا منتخب کلام سُنائیں، اور آخر میں ایک مجموعہ شائع کیا جائے، جِس میں ہر شاعر کا منتخب کلام، تصویر، سوانح اور تحریر کا عکس شامل ہو۔ اِس طرح سے اِس مرقع میں ہماری شستہ اور منجھی ہوئی زبان کے بہترین اور مختلف النوع
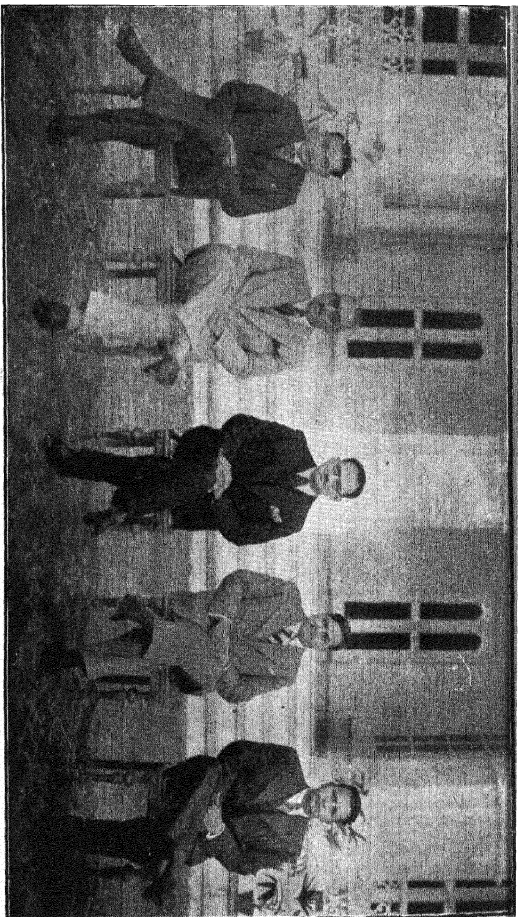
اراکین بزم سخن - داھنے سے بائین طرف

چودھری اکبرعلی صاحب - ایم - اے - کولمبیہ سکریٹری تعلیمات— عالیمرتبت خانبہادر ضمیراحمد ہاشمی بہادر - ایم-اے- پی-سی-ایس- ڈپٹی ریوینومنسٹر رام پور معتمد بزم سخن—عالیمرتبت کرنل سید بشیرحسین زیدی بہادر -سی-آئی-ای- بی-اے- کینٹب بارایٹ لا- چیف منسٹر رام پور صدر بزم سخن— عالیمرتبت صاحبزادہ عبدالجلیل خان بہادر- بی-اے- (علیگ) پی-سی-ایس- ہوم منسٹر رام پور— عالیمرتبت جسٹس معین الدین انصاری بہادر- بی-اے- (کنیٹب) بارایٹ لا- پیونی جج ہائی کورٹ - رامپور

نمونے غزل اور نظم کی شکل میں پیش ہو سکیں گے۔ شعراء کو اصولِ شاعری میں ایک دوسرے سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن اِس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مجموعی طور پر ہر نہج کا باکمال زبان کی خدمت کرتا ہے۔ ایک کے حِصّے میں لفظوں کا پرکھنا، روزمرّہ کی صفائی بندش کی چستی اور سلاست آتی ہے، تو دوسرا نئے لفظوں، نئی ترکیبوں اور نئے خیالات کاٹ چھانٹ کر زمین ہموار کرتا ہے، اور زبان کے لیے نئی راہیں نکالتا ہے۔ یہ دونوں مِل کر اِس کام کو کریں گے، تو ہماری زبان کے پھیلاؤ کے ساتھ اِس کی ادبی گہرائی بھی قائم رہے گی۔

چنانچہ دورِ حاضر کے مشہور شعراء میں سے منتخب حضرات کو دعوت نامے روانہ کیے گئے۔ چند اصحاب بخوشی تیار ہو گئے، کچھ نے شرائط منظور کرائیں اور بعض نے سعادت مندی کا ثبوت طلب کیا۔ یہ طبقۂ شعراء بھی کس قدر مختلف النوع ہے! بہر حال فی الجملہ سب نے کمالِ عنایت و کرم کا اظہار کیا۔ اپنا وقت صرف کیا، سفر کی تکالیف برداشت کیں اور ہم کو نہ صرف اپنی تشریف آوری سے بلکہ اپنا کلام سُنا کر احسان مند بنایا۔ یہ سلسلہ کم و بیش دو برس جاری رہا اور وقتاً فوقتاً رام پور میں مشاعرے ہوتے رہے۔
حضراتِ شعراء سے ہماری استدعا یہ تھی کہ وہ اپنے منتخب کلام، حالاتِ زندگی، تصویر اور تحریر کے نمونے کے ساتھ حسب ذیل سوالوں کے جواب قبلِ تشریف آوری روانہ فرمادیں:-

۱) شاعر کے نزدیک شاعری کا کونسا پہلو اہم ہے؟ اقتصادی،

معاشرتی یا روحانی ؟

۲) شاعر کی نظر میں ہندی سنسکرت وغیرہ کے الفاظ کا شمول کس حد تک مناسب ہے؟

۳) شاعر کی نظر میں اُردو ادب کی خدمت کس نہج سے ہونا چاہیے؟

۴) شعر کے لیے ردیف، قافیہ کی پابندی کہاں تک ضروری ہے؟

۵) (شاعر کے وردِ زبان) کسی دوسرے شاعر کے چند منتخب اور پسندیدہ اشعار۔

۶) نظم اور غزل میں کس کو بہتر اُستاد مانتے ہیں۔ (متقدمین، متوسطین ومتاخرین شعراء میں سے) ؟

کچھ اصحاب نے اِس استدعا کی پذیرائی میں دلچسپی کا اظہار کیا، بیشتر نے رام پور آنے پر اِن امور کی تکمیل کی، اور دو چار نے تھوڑی سی تکمیل کے لیے مہینوں کا انتظار کرایا۔ ایک دو حضرات نے اپنے کلام کے خود انتخاب کرنے کو دشوار بتایا۔ آخر اُن کی رہنمائی سے یہ مرحلہ طے ہوا۔ باوجودِ کوشش، چند حضرات خود رام پور تشریف نہ لا سکے۔ خان بہادر رضا علی وحشت (کلکتہ) ونواب جعفر علی خاں اثر (کاشمیر) کو اپنی خواہش کے باوجود موقع نہ مِلا کہ تشریف لائیں، حضرات صفی (لکھنؤ) اور سائل (دہلی) اپنی علالت کے باعث سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور حضرتِ جلیل نواب فصاحت جنگ حیدرآباد کے طویل سفر سے اجتناب کر گئے۔ ممکن تھا کہ ہم اور انتظار کر سکتے تو کبھی نہ کبھی یہ اصحاب بھی تشریف فرما ہو جاتے؛ لیکن یہاں جلدی

تھی اور اس طرح سلسلہ ختم ہوتا نظر نہ آتا تھا۔

جو اصحاب یہاں تشریف لائے تھے اُن میں سے ساحر دہلوی اور آزاد انصاری انتقال کر چکے ہیں۔ ایک منتخب صحبت میں ساحر آنجہانی کھڑے ہوئے ایک غزل پڑھ رہے تھے۔ دراز قد، لمبی سفید داڑھی اور روشن چہرہ حاضرین کو متاثر کر رہا تھا کہ وہ اس شعر پر پہنچے۔

اِک رہ گیا ہوں میں کہ تمھارا کہیں ہے
کوئی حرم سے، دیر سے منسوب ہو کوئی

مصرعِ ثانی شروع ہوا، تو اُن کی نگاہیں اوپر کو اُٹھ گئیں، آنکھوں میں دفعتاً چمک آگئی اور کچھ نم ہوگئیں۔ کیا معلوم، مرحوم کی آنکھوں نے کیا دیکھا۔ شاید اُن کی آنکھیں اُسی وقت جرعۂ وصال سے سیرکام ہوگئی تھیں۔ اُن کے بیٹھنے کے بعد کافی دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی اور کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ کوئی اور فرمایش کرے۔ تھوڑے عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ انتقال کر گئے۔ آزاد انصاری مرحوم نے سخت سردی کے زمانے میں سفر کیا۔ دسمبر کا مہینہ اُنھوں نے خود پسند کیا تھا۔ صحت اچھی نہ تھی۔ لیکن یہ خیال کبھی نہ ہوتا تھا کہ وہ اِس قدر جلد سب کو خدا حافظ کہہ جائیں گے۔ فانی مرحوم تشریف لانے سے قبل ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ افسوس کہ اُن کے متعلق کسی امر کا تکملہ نہ ہوسکنے کے باعث اِس مجموعے میں اُن کا منتخب کلام وغیرہ شامل نہیں ہے۔

اہلِ رام پور میں شعر و سخن کی گرمی ابھی باقی ہے۔ چنانچہ اس بزم کی جتنی صحبتیں منعقد ہوئیں، رام پور کے اربابِ ذوق نے

اُن کے کامیاب بنانے میں بڑی مدد دی۔ لیکن ارکانِ بزم کی خوش قسمتی اور ترقیٔ علم و ادب کے لیے فالِ نیک اعلیٰحضرت سرکارِ والا تبار و حضور علیا حضرت کی اِن مشاعروں میں ذاتی دلچسپی تھی۔ چنانچہ نہ صرف اعلیٰحضرت اور علیا حضرت نے قدم رنجہ فرماکر متعدد شعراء کا کلام سُنا اور پسند فرمایا، بلکہ ہماری استدعا پر علیا حضرت نے ایک اُردو غزل اور اپنی تحریر کا نمونہ اور اعلیٰحضرت نے ایک ہندی نظم، جو امیرالمومنین حضرتِ علی کرم اللہ وجہہٗ کی منقبت میں لکھی گئی ہے، عطا فرمائی۔ یہ ملوکانہ کلام بھی بصد تشکر اس مجموعے میں شامل کردیا گیا ہے۔

موجودہ جنگ کی ہولناکیوں کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر چھایا ہوا ہے۔ ہر چیز گراں نہیں کمیاب ہوگئی ہے۔ شدید خواہش تھی کہ اس مجموعے کو آراستہ و پیراستہ کرکے دیدہ زیب مرقع کی شکل میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ کاغذ وغیرہ کی گرانی حوصلے کو پست نہ کرسکی تھی، لیکن اشیاء کی کمیابی نے مجبور کردیا۔ بہر حال ایسے حالات میں جو کچھ بن سکا، پیش کیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر مجموعے کی تالیف میں متعدد احباب کی مدد لابدی امر تھا۔ چنانچہ اراکینِ بزمِ سخن کے علاوہ بہت سے اصحاب نے نہ صرف اپنا وقت ہی صرف کیا، بلکہ دام و درم سے بھی بزم کی معاونت کی۔ اگر اِن سب کے نام درج کیے جائیں، تو ایک طویل فہرست ہوجائے گی۔ اِس لیے تمام معاونین کا شکریہ بجائے فرداً فرداً

کرنے کے یکجائی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اراکینِ بزم میں سے خصوصی ذکر کے قابل دو اصحاب ہیں، عالی مرتبت سید بشیر حسین زیدی صاحب بہادر چیف منسٹر جو شعراء کو دعوت دینے کے خیال کے بانی مبانی تھے اور جن کی وجہ سے اِس سلسلے کے تمام لازمی انتظامات ریاست کی جانب سے بغیرِ تردد انصرام پاتے۔ اور دوسرے میرے مرحوم دوست چودھری اکبر علی جو کئی ماہ کی سخت بیماری کا سامنا کرنے کے بعد ہم سب کو خیر باد کہہ گئے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں مغفرت عطا فرمائے۔ مرحوم نے شروع دِن سے نہایت انہماک کے ساتھ جملہ اُمور میں ہاتھ بٹایا تھا۔ اِن کے علاوہ امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا ذکر نہ کرنا خلافِ احسان مندی ہوگا۔ رامپور میں کوئی تصنیف یا تالیف کیوں نہ ہو، اِن کی مرہونِ منت ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مجموعے کی اشاعت بھی اِن کی مساعی کی مرہونِ منت ہے۔

سکریٹریٹ رامپور
۶ر اکتوبر ۱۹۴۴ء

ضمیر ہاشمی
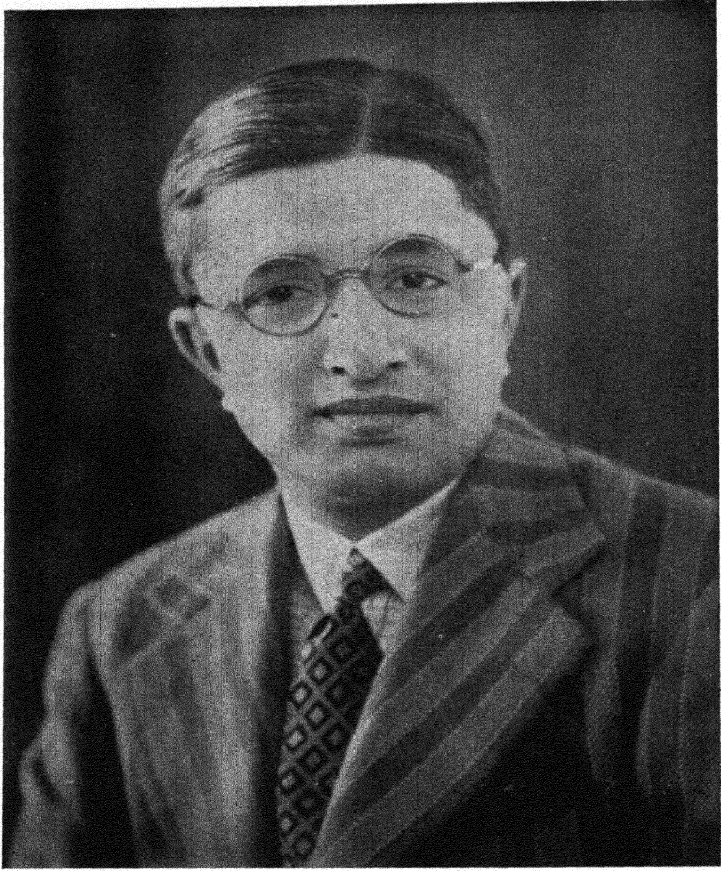
میجر ہزہائنس عالیجاہ فرزند دلپذیر دولت انگلیشیہ مخلص الدولہ ناصر الملک
امیرالامراء نواب ڈاکٹر سر سید محمد رضا علیخان بہادر مستعد جنگ
جی سی آئی ای - کے سی ایس آئی - ڈی لٹ - ایل ایل ڈی
فرمانروائے رام پور

عطیۂ

بندگانِ ہمایونِ اعلیحضرت فرمانروائے رامپور دام اقبالہم و ملکہم

مجرا

تبقریب جشنِ ولادت جناب امیر علیہ السلام

راگ امن کلیان — استائی — تال کہروا

روپ نرالے تمہارے علی جی

منجا

ہی گُن گیانی۔ جگت ہے تمرے سہارے علی جی

انترا نمبر ۱

بیچ بھنور جب نوح کی نیا۔ آن پھنسی تھی۔ تمہیں تھے کھیون ہارے علی جی

انترا نمبر ۲

سلمان جی بھی سنگھ کے مُکھ سے۔ پاگیو مکتی۔ جبھے میں جو تم کو پکارے علی جی

انترا نمبر ۳

پرتھوی راجا بنے سلیماں۔ دیکھ انگوٹھی۔ نام یہ تمرے من ہارے علی جی

انترا نمبر ۴

جیون دے کے پران لیو تم کنتو نصیری۔ تمھیں کو رام پکارے علی جی

انترا نمبر ۵

کرشن کو کو بھگوان کہت ہے۔ کوؤ مراری۔ نام انیک تمہارے علی جی

انترا نمبر ۶

عیسیٰ جنم بیری مریم نکسیں۔ جے جے تمری۔ ایشور بھون میں پدھارے علی جی

انترا نمبر ۷

رجا کے من میں ہے پرکاشت۔ جیوتی تمری۔ نبیؐ کے نین اجیارے علی جی

عکس تحریر علیا حضرت ہر ہائنس دام اقبالہا

غزل

ایسے بیمار کی دوا کیا ہے   جو بتاتا نہیں ہوا کیا ہے

کون سنتا ہے اس زمانے میں   کس سے کہیے کہ التجا کیا ہے

لب بیمار تھرتھراتے ہیں   چپکے چپکے ذرا دعا کیا ہے

مجھکو جو دیکھتا ہے روتا ہے   کوئی کیا جانے ماجرا کیا ہے

حضرت خضر بھی بتا نہ سکے   زندگی کا مدعا کیا ہے

دردِ سر دوسروں کے مت دینا   یہ بس اچھا ہے تو برا کیا ہے

فخر خاتون ہند ہے عصمت

ہم سے پوچھے کوئی وفا کیا ہے

[illegible]

عطیّۂ

علیا حضرت ہر ہائنس دام اقبالہا

ایسے بیمار کی دوا کیا ہے ‏ جو بتاتا نہیں ہوا کیا ہے

کون سنتا ہے اس زمانے میں ‏ کس سے کہیے کہ التجا کیا ہے

مجھ کو جو دیکھتا ہے، روتا ہے ‏ کوئی کیا جانے، ماجرا کیا ہے

حضرتِ خضر بھی بتا نہ سکے ‏ زندگانی کا مدعا کیا ہے

درد پر دوسروں کے ہنس دینا
یہ بھی اچھا ہے، تو برا کیا ہے

آرزو لکھنوی

۲ مئی سنہ ۱۹۴۱ء

آرزو لکھنوی

غزل

رہِ رضا کی فضا زندگی بڑھاتی ہے — قدم قدم پہ ہوا سانس میں اتر آتی ہے

جفائے صحبت پہ غصہ مجھے دکھاتی ہے — یہ نامراد حیرانی کر دکھی جاتی ہے

نظر نواز ہے دن کو بھی شانِ مقتلِ ناز — زمین ٹوٹے ستاروں سے جگمگاتی ہے

نہ جانیں کون سے نقشے کو ہو لگا دام — اجاڑ اجاڑ کے دنیا بسائی جاتی ہے

یہ التفات کی کافر ادا خدا کی پناہ — جو خون کرتی نہیں خودکشی سکھاتی ہے

نا چیز سید انور حسین آرزو

لکھنؤ [illegible] ۱۶ء

[illegible]

امیدوار

آرزو لکھنوی

سرگزشت

سیّد انوار حسین نام، منجھو صاحب عرف، اور آرزو تخلص ہے۔
والد کا نام میر ذاکر حسین یاس، اور سالِ ولادت ۱۲۸۹ ہجری ہے۔
اِن کے مورثِ اعلیٰ عالمگیر کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آکر
فوج میں ملازم ہوئے، اور اجمیر (راجپوتانہ) میں قیام کیا۔ پھر لکھنؤ
چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

حضرتِ آرزو کا درمیانی قد، آفتابی چہرہ اور گندمی رنگ ہے۔
کشادہ پیشانی سے متانت، سنجیدگی اور فراخ حوصلگی کا پتا چلتا ہے۔
تواضع، انکسار، اور خلوص اِن کے نمایاں خصوصیات ہیں۔

ذوقِ شاعری فطری ہے اور بہت کم عمری سے شعر کہتے ہیں۔
اِن کے والد کو اِس شوق کا پتا چلا، تو ہمراہ لے جاکر حضرتِ جلاؔل
لکھنوی کا شاگرد کرادیا۔ اُس وقت اِن کی عمر ۱۳ سال کی تھی۔ رفتہ
رفتہ مشقِ سخن اِس درجہ بڑھی کہ جلاؔل اپنے دوسرے شاگردوں
کی غزلیں اصلاح کے لیے اِن کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔

تصانیف میں تین دیوان حسبِ ذیل ناموں سے طبع ہوچکے ہیں:-

(۱) فغانِ آرزو۔ اِس میں ۱۵ سال سے ۲۵ سال تک کی عمر کا کلام ہے۔

(۲) جانِ آرزو۔ اِس میں ۳۵ سال کی عمر کے بعد کا کلام ہے۔

(۳) سُریلی بانسری۔ اِس میں تیسرے دَور کا کلام جمع کیا ہے، اور یہ خصوصیت ہے کہ اشعار میں عربی یا فارسی لفظ بالکل استعمال نہیں ہوئے ہیں۔

عرصے تک کلکتے میں سکونت رہی۔ آج کل بمبئی میں مقیم ہیں۔

انتخابِ کلام

معصوم نظر کا بھولا پن، للچا کے لُبھانا کیا جانے
دل آپ نشانہ بنتا ہے، وہ تیر چلانا کیا جانے

کہہ جاتی ہو وہ چینِ جبیں، یہ آج سمجھ سکتے ہیں کہیں
کچھ سیکھا ہو تو کام نہیں، دل ناز اُٹھانا کیا جانے

چٹکی جو کلی، کویل کُوکی، اُلفت کی کہانی ختم ہوئی
کیا کِس نے کہا، کیا کِس نے سُنی، یہ بات زمانہ کیا جانے

تھا دیر و حرم میں کیا رکھا، جِس سمت گیا ٹکرا کے پھرا
کِس پردے کے پیچھے ہو شعلہ، اندھا پروانہ کیا جانے

یہ زورا زوری عشق کی تھی، فطرت ہی جِس نے بدل ڈالی
جلتا ہوا دل، ہو کر پانی، آنسو بنجانا کیا جانے

سجدوں سے پڑا پتھر میں گڑھا، لیکن نہ مٹا ماتھے کا لکھا
کرنے کو غریب نے کیا نہ کیا، تقدیر بنانا کیا جانے

آنکھوں کی اندھی خود غرضی، کاہے کو سمجھنے دیگی کبھی
جو نیند اُڑا دے راتوں کی، وہ خواب میں آنا کیا جانے

جِس نالے سے دُنیا بیکل ہے، یہ جلتے دل کی مشعل ہو
جو پہلا لُو کا خود نہ سہے، وہ آگ لگانا کیا جانے

ہم آرزوؔ آئے بیٹھے ہیں، اور وہ شرمائے بیٹھے ہیں
مشتاق نظر گستاخ نہیں، پردہ سرکانا کیا جانے

اے مرے زخمِ دل نواز، غم کو خوشی بنائے جا
آنکھوں سے خوں بہائے جا، ہونٹوں سے مسکرائے جا

سانس کا تار ٹوٹ جائے، ٹوٹے نہ تارِ آہ کا
ایک ہی لے یہ گائے جا، ایک ہی دُھن بجائے جا

حکمِ طلب کے منتظر، شوق کی آبرو نہ کھو
سر کو قدم بنا کے چل، آنکھوں سے مے پلائے جا

مے وہ دوائے تلخ ہے، جس کا اثر ہے خوشگوار
پیتے ہی منھ بنائے جا، دل میں مزے اُڑائے جا

منزلِ بیخودیٔ شوق حدِّ نظر سے دور ہے
پیچھے پلٹ کے بھی نہ دیکھ، آگے قدم بڑھائے جا

اِک ہمہ تن ہے پائے ناز، اِک ہمہ تن سرِ نیاز
یہ تو چلن جہاں کا ہے، جتنا دبے دبائے جا

آرزوؔ، اُس سے کہہ دو صاف، غم کا اثر ہے دیرپا
جلد ہنسی نہ آئے گی اور بھی گدگدائے جا

دن میں سو رنگ سے گو بادِ صبا آ کے گئی
نہ مگر میری تباہی کی ہوا آ کے گئی

اثرِ نالہ مبارک کہ وہ غافل یہ کہے
"دل ہلاتی ہوئی کسکی یہ صدا آ کے گئی"

تھا محبت بھری اک سانس کا وقفہ کتنا
اتنی ہی دیر میں سو بار حیا آ کے گئی

بس یہیں تک تھی رہِ نامۂ پیغام کی حد — نہ صبا جا کے پھر آئی، نہ ہوا آ کے گئی

ہر نفس گردشِ نیرنگ کا محور ہے بنا — وہ پلٹ کر نہ پھر آئی، جو فضا آ کے گئی

الحذر خوگرِ ایذا کا زوالِ نعمت — بن گئی جان پہ، جب کوئی بلا آ کے گئی

کیا بنا دیگا نہ جانے تجھے بڑھتا ہوا حسن — ناز سکھلاتی گئی، جو بھی ادا آ کے گئی

آرزو، مستیٔ شب بن کے رہا دن کا خمار
جھومتی جب کوئی متوالی گھٹا آ کے گئی

یہ داستانِ دل ہی کیا ہو ادا زباں سے — آنسو ٹپک رہے ہیں، لفظیں ملیں کہاں سے

ہے ربط دو دلوں کو بے ربطیٔ بیاں سے — کچھ وہ کہیں نظر سے، کچھ ہم کہیں زباں سے

یہ روتے روتے ہنسنا ترتیبِ ذکرِ غم ہے — آیا ہوں ابتدا پر، چھیڑا تھا درمیاں سے

میدانِ امتحاں میں ہی بغرضِ محبت — دل کی زمین، تو نے ٹکرا دی آسماں سے

اس طولِ خاموشی کا زورِ بیاں بھی دیکھا — تھی بات میرے دل کی، نکلی ترے لب سے

ہی جذبِ شوقِ منزل، ممنونِ غیر کیوں ہوں — خود راستہ بدل کر بچھڑا ہوں کارواں سے

جب حُسن خود نما ہی، اور عشق رخنہ افگن — اِس کشمکش میں پردہ نکلے گا درمیاں سے

حاصل تو زندگی کا تھی زندگی یہیں کی — اب میں ہوں اِک جنازہ اُٹھوا دو آستاں سے

ہر گام پہ ٹھٹکنا، ہر بار رو کے تکنا — او مسکرانے والے! کیا لے چلا یہاں سے

آنکھوں سے باغباں کے شعلے نکل رہے ہیں — تِنکے دبائے مُنہ میں نکلا ہوں آشیاں سے

دل کا سکوں گنوا کر ہوں آرزو، پشیماں
کچھ لے کے رکھ نہ چھوڑا کیوں جنسِ رائیگاں سے

دل لذتِ غم کی نعمت پر، بیجا نہیں جتنا ناز کرے
مِل جائے تو، او ہنسنے والے، تو مجھ سے زیادہ ناز کرے

تاروں پہ فلک، پھولوں پہ چمن، ذرّوں پہ صحرا ناز کرے
کچھ اِس سے الگ، ای حُسنِ عطا، دل جِس پہ ہمارا ناز کرے

پستی پہ بھی ہے اِتنی اونچی، ناکامِ محبت کی منزل
ہو دیکھ کے جِس کو آپ خجل، اور سارا زمانہ ناز کرے

حد سی نہ گزر، سیلاب نہ بن، چکر میں نہ پھنس، گرداب نہ بن
بن ہلکی موج، مگر ایسی جِس موج پہ دریا ناز کرے

بازیچۂ اُلفت میں دل کی کیا اُلٹی سیدھی چالیں ہیں
ہو جیتنے والا شرمندہ اور ہارنے والا ناز کرے

قرباں گہِ اُلفت میں آکر اتنی تو دکھا دے پامردی
قتّال نگاہیں جُھک جائیں، خوں گشتہ تمنّا ناز کرے

یہ معرکۂ اُلفت وہ ہی، جُز فتح شکست نہیں اِسمیں
جیتا جو بچے خود فخر کرے، مرجائے تو دُنیا ناز کرے

تو آرزو، اپنی ہستی کو پابندِ نیازی رہنے دے
ہر ظرف کا ہے اِک پیمانہ، جو چاہے جتنا ناز کرے

مرقدِ نورجہاں

آرام کے تھے ساتھی کیا کیا، جب وقت پڑا تو کوئی نہیں
سب دوست ہیں اپنے مطلب کے، دُنیا میں کسی کا کوئی نہیں

جو باغ تھا کل پھولوں سے بھرا، اٹھکھیلیوں سے چلتی تھی ہوا
اب سنبل و گل کا ذکر تو کیا، خاک اُڑتی ہے، اُس جا کوئی نہیں

بیٹھے ہیں کہاں اہلِ مسند، آغاز وہ نیک، انجام یہ بد!
یا بزمِ طرب، یا کُنجِ لحد، یا وہ مجمع، یا کوئی نہیں

کل جن کو اندھیرے سے تھا حذر، رہتا تھا چراغاں پیشِ نظر
اِک شمع جلادے تربت پر، حُزر داغ، اب اِتنا کوئی نہیں

قتالِ جہاں معشوق جو تھے، سُونے ہیں پڑے مرقد اُن کے
یا مرنے والے لاکھوں تھے، یا رونے والا کوئی نہیں

اوّلِ شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

قید کو توڑ کے نکلا جب میں، اُٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے
دشتِ عدم تک جنگل جنگل بھاگ چلا ویرانہ بھی

لاگ میں حُسن و عشق کی اکثر چھیڑ اُدھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا، اُڑ کے چلا پروانہ بھی

دونوں جولاں گاہِ جنوں ہیں، بستی کیا ویرانہ کیا
اُٹھ کے چلا جب کوئی بگولا، دوڑ پڑا دیوانہ بھی

غنچے چُپ ہیں، گُل ہیں ہوا پر، کس سے کہیے دل کا حال
خاک نشیں اِک سبزہ ہے، اپنا بھی بیگانہ بھی

ایک لگی کے دو ہیں اثر، اور دونوں حسبِ مراتب ہیں
لَو جو لگائے شمع کھڑی ہے، رقص میں ہے پروانہ بھی

دورِ مسرت، آرزو، اپنا کیسا زلزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے منھ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

سچ بھی بُرا وہ جس کو سُن کر لوگ کہیں تو جھوٹا ہے
جس کا لٹایا سب نے پایا، مجکو اُسی نے لُوٹا ہے

تارہ ٹوٹا، دیکھا سب نے یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی
کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا، کس کا سہارا ٹوٹا ہے

پتّہ کیسا، بوٹا کیسا، جڑ تو ایک ہے دونوں کی
کہنے کو ہم بھی کہہ دیتے ہیں، یہ پتّہ ہے، یہ بوٹا ہے

الگ رہے جیتے جی سدا جو، وہ رو رہے تھے لپٹ لپٹ کے
گھڑی گھڑی پھرتی پتلیوں نے سماں یہ دیکھا پلٹ پلٹ کے

جو آنسو آنکھوں میں آچکے ہیں، کہاں وہ جائیں گے اب پلٹ کے
یہ چڑھتے پانی کے ہیں تھپیڑے، پڑیں گے مُنھ پر اُلٹ اُلٹ کے

کٹار چتون لیے کھڑی تھی، کرید کرنے کو میرے جی کے
لہو تھا جتنا بھی دل بھر میں، سب اِک جگہ آ گیا سمٹ کے
بھنور سے نکلی جو ناؤ بچ کر، تو پار اُترنے میں کھائی ٹھوکر
بڑھا کے رکھا تھا پاؤں جس پر، وہی کگار اگر اہی پھٹ کے
جو مار رکھا ہے تم نے جی کو، نہ آرزو اب ہُمَکنے دینا
ہوئی جو مُٹھی ذرا بھی ڈھیلی، یہ سانپ کاٹے گا پھر پلٹ کے

آزاد انصاری

۲۲ نومبر ۱۹۴۱ء
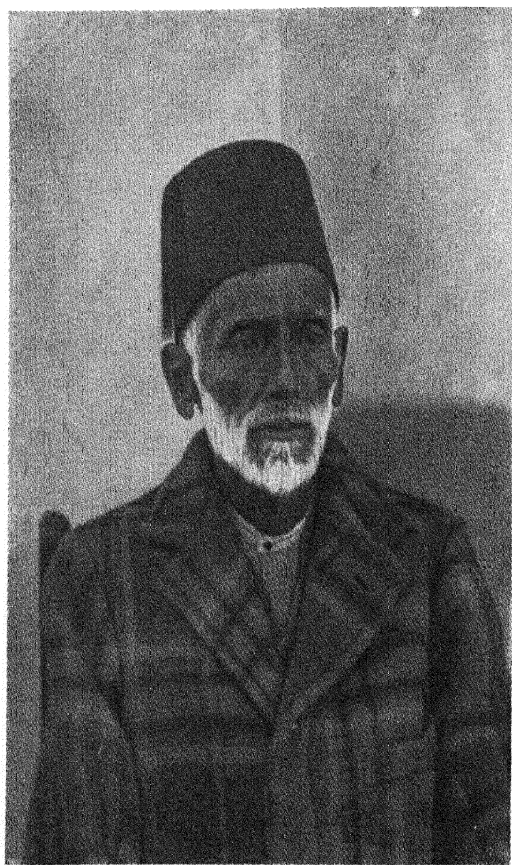
آزاد انصاری

ترے سے بے خبر تو یہ کیا تمام خبر ہے - کہ تو مبتدا اور عالم خبر ہے

اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جچتا - تو جا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

زباں تک شکوۂ محرومیٔ دیدار آنا تھا - خطاب آیا کہ جا اور طاقتِ دیدار پیدا کر

تجھے آزاد! یوں درویش کامل کون مانے گا - جہاں سے ہو، جریدہ جبہ و دستار پیدا کر

بت کافر! یہ واضح ہو، خدا بھی اپنے بندوں پر - فقط ظلم و ستم کر کے خدائی کر نہیں سکتا

ازل سے جو سرشت رند مشرب لیکے آتا ہے - ابد تک وہ گناہ پارسائی کر نہیں سکتا

جہاں آزاد اب بے خوف سرگرم تکلم ہے
وہاں روح القدس بھی لب کشائی کر نہیں سکتا

خاکسار الطاف احمد آزاد انصاری سہارنپوری بقلم خود

رام پور (ریاست) ۲۲ نومبر سنہ ۱۹۴۱ء

آزاد انصاری

سرگزشت

الطاف احمد نام، ابوالاحسان کنیت، اور آزاد تخلص ہے۔ نسلاً انصاری، اور سہارنپور کے باشندے ہیں۔

ناگپور میں، جہاں اِن کے والد اُورسیر تھے، ۲۷ رجب سنہ ۱۲۸۹ھ کو اِن کی ولادت ہوئی، اور نظیر حسین تاریخی نام رکھا گیا۔ سات سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، تو نانا کی پرورش میں آگئے۔ آٹھ نو سال کی عمر میں قرآنِ مجید ختم کرکے، مولوی عبداللہ انصاری سے گلاؤٹی میں فارسی، اور مولوی صدیق علی سے مالیر کوٹلے میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں نانا کا انتقال ہوگیا، اور یہ سہارنپور چلے آئے۔ یہاں آکر حافظ نیاز علی بریلوی سے فارسی کی اور مولوی بشیر احمد علیگڑھی سے عربی کی تکمیل کی۔ ابھی ۱۸، ۱۹ سال کی عمر تھی کہ شادی ہوگئی، اور مزید تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد معاشی ضروریات کے تحت حکیم نور احمد سہارنپوری اور ڈاکٹر احمد خاں لکھنوی سے طِب پڑھی۔ سنہ ۱۹۰۶ء سے سنہ ۱۹۲۳ء تک طِبابت ہی

ذریعۂ معاش رہا۔ اس کے بعد حیدر آباد جاکر عینک فروشی اختیار کی، جو ابتک جاری ہے۔

آزاد، اوسط قد، گندمی رنگ، چھریرے جسم اور موزوں خد و خال کے شاعر ہیں۔ گرم و سردِ زمانہ کا پورا تجربہ رکھتے ہیں، اور شایستگی، متانت، خوش اخلاقی، پختگیٔ وضع اور پُرانی تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔

شعر گوئی کا شوق ۱۳، ۱۴ سال کی عمر سے تھا۔ لیکن مہمل ہونے کے ڈر سے نہ کسی کو شعر سُناتے اور نہ کسی مشاعرے میں پڑھتے۔ بالآخر ۱۹۰۸ء میں مولانا حبیب الرحمٰن بیدؔل (شاگردِ حضرتِ غالب) سے تلمذ اختیار کیا، اور عطارؔد تخلص سے غزلیں کہہ کر مشاعروں میں پڑھنے اور رسائل میں طبع کرانے لگے۔

شعر گوئی کے ابتدائی دَور میں اُستاد ذوؔق کے اتباع کی کوشش کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد داؔغ، امیؔر، جلاؔل وغیرہ اساتذہ کے کلام کا مُطالعہ کیا، تو اِن حضرات کے رنگ پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس سے بھی دل سیر ہوگیا، اور طبیعت کو کسی اور شاہراہ کی تلاش ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اِن کے اُستاد (بیدؔل) حیدر آباد کے دَار العُلوم میں ملازم ہوکر جا چکے تھے، اور شمالی ہندوستان میں علامہ حاؔلی کا کلام اپنی مقبولیت کا سِکّہ چلا رہا تھا۔ اس بے خضری کے زمانے میں آزاد نے اُن کا مجموعۂ کلام پڑھا، اور اُس سے اِس قدر متاثر ہوے کہ پچھلا سارا ذخیرہ نذرِ آتش کردیا۔ سابق تخلص عطارؔد

کو خیر باد کہہ کر آزاد تخلص اختیار کیا، اور سہارنپور سے پانی پت جا کر حضرتِ حالی کے شاگرد ہو گئے۔ چنانچہ موصوف سے اصلاح لینے کا سلسلہ اُن کی ۱۹۱۴ء میں وفات تک برابر جاری رہا۔

حضرتِ آزاد اُردو زبان کے اندر ہندی اور سنسکرت کے صرف اُنھیں ہلکے پھلکے الفاظ کا استعمال روا رکھتے ہیں، جن میں آسانی کے ساتھ زبان میں کھپ جانے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، اور اُن کھرا جیتی الفاظ کے سخت مخالف ہیں، جن کے رواج دینے کی آج کل جد و جہد کی جا رہی ہے۔

زبان کے لیے مضمون کو پامال کرنا اور مضمون کے لیے زبان کا خون کرنا کسی حد تک مناسب نہیں سمجھتے۔

نظم میں میر انیس، حالی اور اقبال کو، اور غزل میں غالب، مومن، مصحفی اور میر تقی کو اُستاد مانتے ہیں۔

دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار یہ ہیں:۔

حالی

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے اور سہی، تو مگر کہاں

لا اعلم

جوانی اور بوئے گل میں، یا رب! کیا تعلق تھا
کہ بوئے گل کے آتے ہی جوانی یاد آتی ہے

غالب

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ذوقؔ — اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا، تو کدھر جائیں گے

مجروحؔ — شبِ فرقت تو بسر ہو، یارب!
صبح کو روزِ قیامت ہی سہی

اقبالؔ — وہ فریب خوردہ شاہیں، جو پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

جنابِ آزادؔ نے معارفِ جمیل میں لکھا ہے کہ حسبِ ذیل خصوصیات اُن کے اپنے کلام میں بکثرت و بالتزام ہیں:-

(۱) الفاظ کی ترتیب۔

(۲) سلاست و صفائیٔ زبان۔

(۳) ندرتِ بیان۔

(۴) تکرارِ الفاظِ حسیں۔

(۵) صنعتِ ترصیع و تقابل۔

(۶) صنعتِ ترصیعِ جدید کی ایجاد۔

(۷) اصطلاحاتِ علمیہ کا اِستعمال۔

معلوم ہوا کہ آخرِ ۱۹۴۲ء میں حضرتِ آزادؔ کا انتقال ہوگیا۔

انتخابِ کلام

شکریۂ سرکار

لائی ہے قدر دانیٔ اصحابِ قدرداں	آیا ہوں حسبِ دعوتِ سرکارِ رام پور
سمجھا مجھے بھی لائقِ لطف و عطای خاص	شکریّہ عنایتِ سرکارِ رام پور

شکر ہے شکر، مجھ پہ بھی چمکا	مہرِ تابانِ رام پور اسٹیٹ
شکر ہے شکر، مجھ پہ بھی برسا	ابرِ بارانِ رام پور اسٹیٹ
شکر ہے شکر، میں بھی آ پہنچا	زیرِ دامانِ رام پور اسٹیٹ
شکر ہے شکر، میں بھی دیکھ سکا	عالمِ شانِ رام پور اسٹیٹ
شکر ہے، مجھ پہ بھی ہوا نازل	لطف و احسانِ رام پور اسٹیٹ
شکر ہے میرے بھی نصیب میں تھی	دعوتِ خوانِ رام پور اسٹیٹ

کیوں نہ قسمت پہ اپنی ناز کروں
کہ ہوں مہمانِ رام پور اسٹیٹ

حق بنا، باطل بنا، ناقص بنا، کامل بنا
جو بنا نا ہو بنا، لیکن کسی قابل بنا
شوق کے لائق بنا، ارمان کے قابل بنا
اہلِ دل بننے کی حسرت ہے، تو دل کو دل بنا

عقدہ تو بیشک کھلا، لیکن بہ صد دقّت کھلا

کام تو بے شک بنا، لیکن بہ صد مشکل بنا

جب اُبھارا ہی، تو اپنے قرب کی حد تک اُبھا

جب بنایا ہی، تو اپنے لطف کے قابل بنا

سب جہانوں سے جدا اپنا جہاں تخلیق کر

سب مکانوں سے جدا اپنا مکانِ دل بنا

پھر نئے سر سے جنونِ قیس کی بُنیاد رکھ

پھر نئی لیلا بنا، ناقہ بنا، محمل بنا

یہ تو سمجھے، آج آزاد ایک کامل فرد ہی

یہ نہ سمجھے، ایک ناقص کس طرح کامل بنا

ای کاش خبر ہوتی، تو دل سے بھلا دیگا
ای کاش خبر ہوتی، تو دِل کے دغا دے گا

اک روز ترا سودا ہر خبط مٹا دے گا
اک روز ترا ملنا اللہ سے ملا دے گا

تم جبر کیے جاؤ، ہم صبر کیے جائیں
اللہ تو منصف ہی، اللہ تو جزا دے گا

امیدِ سکوں رخصت، تسکینِ دروں رخصت
اب درد کی باری ہی، اب درد مزا دے گا

اِک روز دلِ رہزن خود راہ نما ہوگا
اِک روز یہی دشمن منزل کا پتا دے گا

آزادِ گدا مشرب، دنیا سے غرض، مطلب

کوئی ہمیں کیا دے گا، دے گا تو خدا دے گا

نہ یہ سامان پیدا کر، نہ وہ سامان پیدا کر
بہ استقلال یکسو ہو کے اطمینان پیدا کر

نرالی آن پیدا کر، انوکھی شان پیدا کر
جگر زخمی، دل آشفتہ، نظر حیران پیدا کر

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دیگی
ذرا آہستہ آہستہ اِدھر رجحان پیدا کر

جو اُلفت ہے، تو اُلفت کی نظر سے مطمئن فرما
جو دعویٰ ہے، تو دعوے پر کوئی بُرہان پیدا کر

تغافل پر تغافل کوششِ تحصیلِ حاصل ہے
جفا میں بات پیدا کر، ستم میں شان پیدا کر

مآلِ کار اظہارِ تمنا کیا گذارش ہو
طبیعت طنز کرتی ہے کہ ارمان پیدا کر

اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جچتا
تو جا اور جا کے اہلِ اللہ کی پہچان پیدا کر

ستم دوست، فکرِ عداوت کہاں تک؟
کہاں تک وفا سے بغاوت کہاں تک؟

خلافِ سلوکِ محبت کے خوگر
خلافِ سلوکِ محبت کہاں تک؟

مُسلسل ستم کی حکومت کے بانی
مُسلسل ستم کی حکومت کہاں تک؟

اُٹھو، درد کی جستجو کر کے دیکھیں
تلاشِ سکونِ طبیعت کہاں تک؟

کبھی حُکمِ پیرِ مُغاں بھی بجا لا
فقط اتباعِ شریعت کہاں تک؟

کبھی کچھ نتیجہ نکالو، تو جانیں!
فقط خبطِ معلول و علت کہاں تک؟

نہ پوچھو، کون ہیں، کیوں راہ میں ناچار بیٹھے ہیں
مسافر ہیں، سفر کرنے کی ہمت ہار بیٹھے ہیں

اِدھر پہلو سے تم اُٹھے، اُدھر دُنیا سے ہم اُٹھے
چلو، ہم بھی تمہارے ساتھ ہی بیکار بیٹھے ہیں

کسے فرصت کہ فرضِ خدمتِ اُلفت بجا لائے
نہ تم بیکار بیٹھے ہو، نہ ہم بیکار بیٹھے ہیں

جو اُٹھے ہیں، تو گرمِ جستجوے دوست اُٹھے ہیں
جو بیٹھے ہیں، تو محوِ آرزوے یار بیٹھے ہیں

مقامِ دستگیری ہے، کہ تیرے رہروِ اُلفت
ہزاروں جستجوئیں کرکے ہمّت ہار بیٹھے ہیں

نہ پوچھو، کون ہیں، کیا مدعا ہے؟ کچھ نہیں بابا
گدا ہیں اور زیرِ سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

یہ ہو سکتا نہیں، آزادؔ سے میخانہ خالی ہو
وہ دیکھو، کون بیٹھا ہے؟ وہی سرکار بیٹھے ہیں

یہ اِک شانِ خدا ہے، میں نہیں ہوں
وہی جلوہ نما ہے، میں نہیں ہوں

زمانہ پہلے مجھکو ڈھونڈتا ہے
مگر تیرا پتا ہے، میں نہیں ہوں

ترے ہوتے، مِری ہستی کا کیا ذکر
یہی کہنا بجا ہے، میں نہیں ہوں

صدائے "نَحنُ اَقرَبُ" کہہ رہی ہے
کہ تو مجھ سے جُدا ہے، میں نہیں ہوں

وہ خود تشریف فرماے جہاں ہیں
تمھیں دھوکا ہوا ہے، میں نہیں ہوں

کہاں میں اور کہاں خبطِ اَنَاالحَقّ
کوئی میرے سِوا ہے، میں نہیں ہوں

مجھے آزادؔ دنیا کیوں نہ پوجے
کسی کا نقشِ پا ہے، میں نہیں ہوں

تجدیدِ محبّت کے ارمان

پھر تقاضاے نظر سلسلہ جنباں ہوگا
پھر تماشاے بہارِ رُخِ جاناں ہوگا

پھر سکوں عالمِ وحشت میں بدل جائیگا
پھر جنوں گرمِ تقاضائے بیاباں ہوگا

پھر نڈر عرصۂ الفت میں قدم رکھونگا
پھر وہی پائے ثبات اور وہی میداں ہوگا

پھر وہی نغمۂ دل دوزِ وفا چھیڑوں گا
پھر وہی زخمہ، وہی تارِ رگِ جاں ہوگا

پھر تعشق کا جنوں اور سوا ابھرے گا
پھر تعلق میں غُلو اور دوچنداں ہوگا

پھر نئے سر سے محبت کے مزے آئیں گے
پھر نیا سلسلۂ حسرت و ارماں ہوگا

پھر کوئی غیرتِ گلزارِ جہاں دل لیگا
پھر مقدر گُلِ مقصود بہ داماں ہوگا

پھر گلستانِ محبت میں بہار آئے گی
پھر شبستانِ تمنّا میں چراغاں ہوگا

پھر تمنّائے حزیں سازِ طرب چھیڑیگی
پھر دلِ غمزدہ خوش ہو کے غزلخواں ہوگا

پھر مرا دُکھ مجھے تسکینِ دوا بخشے گا
پھر مرا درد مجھے غیرتِ درماں ہوگا

پھر مری طبع مجھے کفر کی دعوت دیگی
پھر مرا کفر مجھے دعوتِ ایماں ہوگا

پھر امیدِ کرمِ یار میں خوش گزریگی
پھر علاجِ ستمِ گردشِ دوراں ہوگا

پھر مجھے فکرِ دو عالم سے نجاتیں ہونگی
پھر مجھے زیست کا ہر مرحلہ آساں ہوگا

غلط، آزاد، ترے دل کے یہ شبہات غلط
مطمئن ہوں کہ مرے درد کا درماں ہوگا

اثر رامپوری

۲۰ فروری سنہ ۱۹۴۲ء
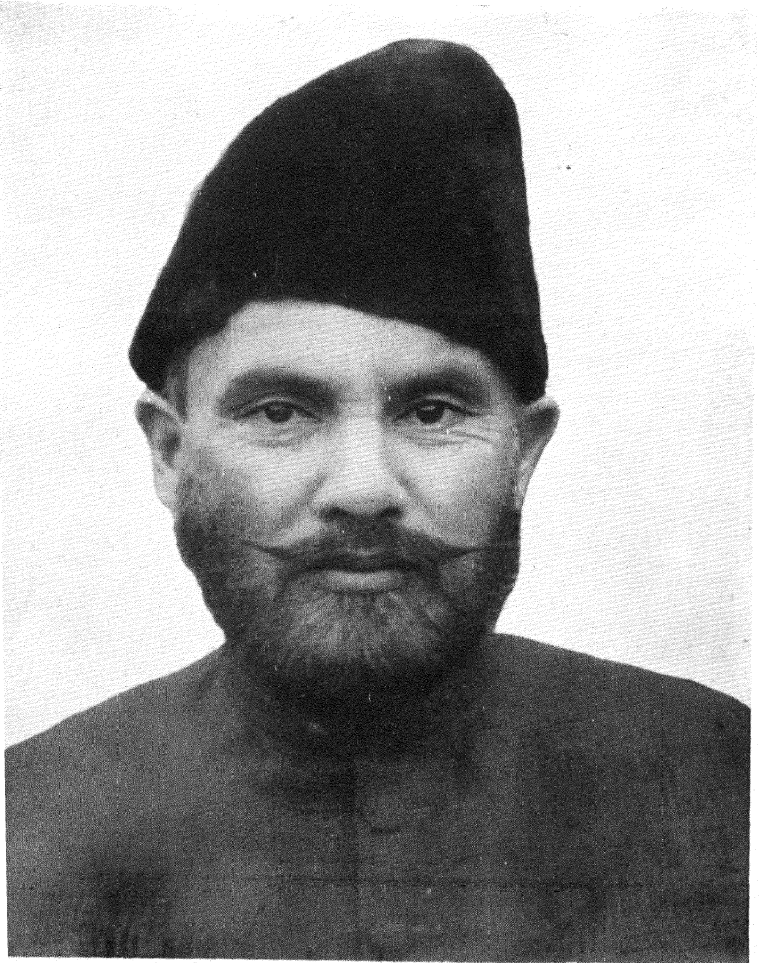
اثر رامپوری

غزل

وہ انکا حجاب اور نزاکت کے نظارے
آئے وہ شب وعدہ تصور کے سہارے

وہ کالی گھٹا اور وہ بڑھتے ہوئے دھارے
زاہد بھی اگر دیکھے تو ساقی کو پکارے

وہ جلوہ گہ ناز، وہ مخمور نگاہیں
اب کیا کہوں یہ لمحے کہاں مین نے گزارے

خود حسن کا معیار مرا ذوق نظر ہے
اتنے ہی حسین آپ ہین جتنے مجھے پیارے

بے وجہ نہین حسن کی تنویر مین تابش
لو دیتے ہین خاکستر الفت کے شرارے

تم چاہو تو دو لفظون مین طے ہوتے ہین جھگڑے
کچھ شکوے ہین بیجا مرے کچھ عذر تمہارے

پھر جام بکف ہوگئی ہر چیز اثر آج
یاد آگئے پھر مد بھری آنکھونکے اشارے

محمد علی خان اثر رامپوری

[signature]

۲۰ فروری سنہ ۱۹۴۲ء

اثر رامپوری

سرگزشت

محمد علی خاں نام، اثر تخلص، قوم پٹھان احمد زئی، سالِ ولادت ۱۸۹۲ء، سکونت رام پور، والد کا نام مولوی محمد شفیع خاں اور دادا کا نام شاہ نواز خاں ہے۔

قرآنِ مجید اور ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، فارسی کی متداول درسی کتابیں مولوی عبدالرزاق خاں طالب سے پڑھیں، اور منشی فاضل کا امتحان مولوی سید اولاد حسین شاداں بلگرامی سے پڑھ کر پاس کیا؛ عربی میں زیادہ تر مولانا سلامت اللہ صاحبؒ سے تلمذ رہا ہے۔

درمیانی قد، دُہرا جسم، فراخ پیشانی، خوش قطع چہرہ اور سُرخ و سپید رنگ ہے۔ اسلامی اخلاق اور شایستگی کا نمونہ، صوم و صلوٰۃ کے پابند اور اہلِ علم کے قدردان ہیں۔

ابتدائی مشق میں کسی سے مشورۂ سخن نہیں تھا۔ ۱۹۳۵ء سے جناب جلیل مانکپوری کے پاس اپنا کلام بھیجنا شروع کیا؛ لیکن موصوف کی عدیم الفرصتی کے باعث اصلاح میں تاخیر ہوتی تھی، اس لیے

سنہ ۱۹۴۱ء میں حضرتِ آرزو لکھنوی کی خدمت میں چند غزلیں روانا کیں۔

آج کل رام پور اسٹیٹ کونسل کے سپرنٹنڈنٹ آفس ہیں۔ ملازمت کی مشغولیت کے باعث مشقِ سخن کے لیے وقت نہیں ملتا، تاہم احباب کی فرمایشوں کو پورا کرتے ہیں، اور مقابلے کی نظمیں لکھ کر وقتاً فوقتاً اِنعامات حاصل کرتے رہتے ہیں۔

تالیفات میں نثر کی چند مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ایک مجموعہ "وطن کے گیت" طبع ہوچکا ہے۔

نظم میں میر انیسؔ اور علامہ اقبالؔ کو اور غزل میں میرؔ، غالبؔ، جلیلؔ اور آرزو کو اُستاد مانتے ہیں۔

اِن کی رائے میں شاعری کا اہم پہلو محاکات اور واقعہ نگاری ہے۔ اُردو شاعری میں غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے کے خلاف ہیں خواہ وہ کسی زبان کے ہوں۔

اشعار میں قافیہ و ردیف کی ضرورت کے قائل ہیں، اس لیے کہ حروف کی تکرار سے نظم، نظم معلوم ہوتی ہے اور ردیف سے حسنِ کلام میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اِن کو دیگر اساتذہ کے یہ اشعار بہت پسند ہیں :-

مومنؔ
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حسرتؔ
نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

جلیل — محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں، طغیانی نہیں جاتی

〃 — نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہیں، مگر دیکھنے کی تاب نہیں

نظام رامپوری — دینا وہ اُس کا ساغرِ مے یاد ہے نظام
مُنھ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

اُردو ادب کی ترقی کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ

(۱) کل ہندوستانی انگریزی داں طبقہ آپس میں ہمیشہ اُردو میں بات چیت کرے اور اُردو ہی میں لکھا کرے۔

(۲) دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے بکثرت ترجمے شائع ہوں۔

(۳) کتابیں بکثرت تصنیف کی جائیں، اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل کرنے کی کوشش کی جائے۔

انتخابِ کلام

حُسن اُدھر مست، اِدھر عشق کو کچھ ہوش نہیں
اب کوئی شے نہیں، جو میکدہ بردوش نہیں

چشمِ میگوں نے کیا ایک ہی جلوے میں خراب
کِس کو اب دیکھوں، کہ اپنا ہی مجھے ہوش نہیں

ہٹ گئی خود، کہ ہٹالی گئی چہرے سے نقاب
بات کچھ ہو، مگر اب تک وہ فراموش نہیں

ہجر ہے نام تصور کے فنا ہونے کا
وصل وہ ہے کہ جہاں ہوش کو بھی ہوش نہیں

دیکھ کر جلوۂ حق، بت کو کیا ہے سجدہ
سمت بھولا ہوں، مگر قبلہ فراموش نہیں

کیا چھپائے گی، آخر، حُسن کے جلوے کو نقاب
برق بادل میں نہاں رہ کے بھی روپوش نہیں

ہائے! دل یادِ خدا بھُول گیا — قبلے کو قبلہ نُما بھُول گیا
بن کے سائل بھی نہ نکلا کچھ کام — در پہ پہنچا، تو صدا بھُول گیا
لذتِ کاوشِ ناوک مت پوچھ — درد اُٹھا، تو دوا بھُول گیا
ایک دیوانے کی باتوں پہ نہ جا — کیا خبر، کیا کہا، کیا بھُول گیا
ہائے! اِک بات رہی جاتی ہے — کچھ ابھی کہنے کو تھا، بھُول گیا

اُس نے ہنسکر جو کہا "بھول گیا" ہو گئی سیکڑوں وعدوں کی وفا

یاد رکھنے کی ہے یاد اُس کی اثرؔ
اور جو بھول گیا، بھول گیا

تم بچ کے کہاں جاؤ گے ارباب نظر سے
خود نقش قدم اُبھرینگے گزروگے جدھر سے

آغازِ محبت ہوا دل سے کہ نظر سے
معلوم نہیں، فتنہ یہ اُٹھا ہے کدھر سے

ہر ذرّے پہ جوبن ہی، ہر اک شے پہ جوانی
کچھ اور ہی عالم ہی، وہ گزرے ہیں جدھر سے

کیا آبِ رواں، کیا شبِ مہ، کیا گل و لالہ
دُنیا ہے حسیں آج مرے حسنِ نظر سے

کیا جوشِ رقابت ہی کہ ہنگامِ نظارہ
یہ ظن ہوا جاتا ہوں ہیں خود اپنی نظر سے

نسبت کا یہ صدقہ ہی کہ کرتے ہیں خدائی
وہ بُت جو نکالے گئے اللہ کے گھر سے

میکش نے کہا نشہ، تو صوفی نے کہا وجد
حال اپنا تماشا ہے، اثرؔ، فرقِ نظر سے

وہ جو نہیں، تو بزم میں بزم کی شان بھی نہیں
پھول میں دلکشی نہیں، چاند میں چاندنی نہیں

ڈھونڈھا نہ ہو جہاں اُنھیں، ایسی کوئی جگہ نہیں
پائی کچھ اُن کی جب خبر، اپنی خبر رہی نہیں

آنکھ میں ہو پرکھ، تو دیکھ حُسن سے پُر ہی کُل جہاں
تیری نظر کا ہی قصور، جلووں کی کچھ کمی نہیں

عشق میں شکوہ کفر ہی، اور ہر التجا حرام
توڑ دے کاسۂ مراد، عشق گداگری نہیں

جوشِ جنونِ عشق نے کام مرا بنا دیا
اہلِ خرد کریں معاف، حاجتِ آگہی نہیں

اُف! یہ نشیلی انکھڑیاں، ہائے! یہ مستیٔ شباب
مانا کہ تم نے پی نہیں، کون کہے گا، پی نہیں

ہجر کی شب گزر گئی، پھر بھی اثر یہ حال ہے
سامنے آفتاب ہے اور کہیں روشنی نہیں

ساقیا! دور میں اب لا عوضِ جام کچھ اور
کہہ رہی ہے روشِ گردشِ ایام کچھ اور

تا کجے حفظِ دل و چشم کی سعی ناکام
تجھ سے لینا ہے محبت مجھے اب کام کچھ اور

یاد پھر آئی ہیں آغازِ جنوں کی راتیں
اور پیچھے کو پلٹ گردشِ ایام کچھ اور

حسن کا مرتبہ حیرت نے سمجھنے نہ دیا
جتنا دیکھا اُنھیں، بڑھتا گیا ابہام کچھ اور

حسن پر قیدِ تعین سے اُدھر حرف آیا
اور اِدھر حدِ نظر نے کیا بدنام کچھ اور

اک نئے تکمیلِ نظر، ایک سے توہینِ نظر
حسنِ در پردہ جدا، حسنِ سرِ بام کچھ اور

اُن کے وعدے ہی بدلتے نہیں دن رات اثر
حال عالم کا یہ ہے، صبح کچھ اور شام کچھ اور

مقصدِ حیات

یاد ہے اب تک مجھے تاروں بھری وہ ایک رات
سو رہی تھی بے خبر جس وقت ساری کائنات

کاروانِ نور تھا آہستہ سرگرمِ سفر
تا کہ عالم لغزشِ پا سے نہ ہو زیر و زبر

میں نے پوچھا اے فلک کے ماہ پارو! کچھ کہو
زندگی کا کیا ہے مقصد، اے ستارو کچھ کہو

ہے نجوم و ہیئت و تاریخ کا تم پر مدار — اور شبِ غم کی بھیانک رات کا تم ہو سنگھار

جستجو میں کس کی پھرتے ہو پریشاں تم مدام — فکر کیا ہے، خواب و خور جس نے کیا تم پر حرام

کیسا افسانہ ہے، جو رہتا ہے ہر شب ناتمام — انجمن پر انجمن کا کس لیے ہے اہتمام

سن کے یہ چکر میں آئے رنگ چہروں کا اڑا — صورتِ شبنم پسینہ خوفِ افشا سے بہا

آئی لرزے میں بنائے گنبدِ چرخِ کبود — جھلملائیں نور کی شمعیں، اٹھا طوفانِ دود

آہ! پھر تو کل ستارے نذرِ طوفاں ہو گئے — بات منہ سے کچھ نہ نکلی تھی کہ پنہاں ہو گئے

دیکھ کر یہ پردۂ مشرق سے نکلا آفتاب — شب کی بیخوابی سے آنکھیں سرخ تھیں مثلِ شہاب

ظلمتِ گیتی مٹاتا تابشِ رخسار سے — غسل کر کے آ رہا تھا چشمۂ انوار سے

چہرۂ روشن پہ ڈالے ایک نارنجی نقاب — جس کے پرتو سے شفق پرور تھا دامانِ سحاب

گیسوئے شب پشت پر ڈالے ہوئے با احتشام — ابلقِ ایام کی تھامے ہوئے زریں لگام

دوش پر رکھے ہوئے بارِ نظامِ کائنات — کاسۂ زریں سے سب کو بانٹتا رزقِ حیات

دہر پر بکھرا کے گیسوئے شعاعِ زرنگار — ذوقِ خدمت کے جنوں میں کر کے دامن تار تار

جوش میں بولا زبانِ حال سے "سن غور کر — زندہ وہ ہے جس نے خدمت کیلیے باندھی کمر

کاہلی ہے جس کی دشمن، عیش ہے جس پر حرام — خواب و خور آرام و راحت سے نہیں کچھ جسکو کام

خدمتِ مخلوق جس کی زندگی کا ہو اصول — دوسروں کے غم میں اپنی ذات کو جاتا ہے بھول

زندگی نامِ عمل ہے، بے عمل بے جان ہے — زندہ و مردہ کی دنیا میں یہی پہچان ہے

دیکھ پہلے بزمِ قدرت کے نظامِ کار کو — بات سب کی سن، مگر دھیما نہ کر رفتار کو

ایک اک لمحے کو وقفِ خدمتِ مخلوق کر — گھر میں فاقہ ہو تو ہو، بھوکوں کا لیکن پیٹ بھر

بگڑے کاموں کو بنا، گرتوں کا بازو تھام لے — ورنہ تو اپنی بزرگی کا نہ ہرگز نام لے

آگ بھڑکے، تو عمل سے اپنے تو گلزار کر　　پانوں میں کانٹا چبھے، تو آبلوں سے پیار کر

خدمتِ مخلوق سے ملتی ہے پایندہ حیات　　اور ملتا ہے اسی سے خالقِ کل کائنات

پردہ غفلت کا تری آنکھوں سے جب اٹھ جائیگا

ذرّے ذرّے سے، اثرؔ، تو درسِ عبرت پائیگا

اثرِ صہبائی

۲۳ دسمبر ۱۹۴۱ء

باسمہٖ سبحانہٗ

صبحِ طرب میں شامِ غم جامِ نشاط میں الم

پردۂ زیست میں عدم ہائے یہ چیستاں ہے کیا

یاد تری شراب ہے ذکر ترا سرور ہے

کیفِ طرب میں موجزن میرا یہ وجود ہے

فکرِ دل و جگر نہ کر عشق میں جان بھی گزار

اس میں کہیں زیاں نہیں، اس میں زیاں بھی سود ہے

اب اس میں نہیں کچھ بھی بجز نغمہ و خوشبو

تیرے لیے کاشانۂ دل کو ہے سنوارا

دنیا کے ہر اک حسن سے محجوب ہے لیکن

یہ صبحِ سکوں کیش کا معصوم ستارا

بقلم خود

عبدالسمیع پال اثر صہبائی، ایم اے ایل ایل بی

۲۳ دسمبر ۱۹۴۱ء

رام پور ریاست، یو۔پی

اثر صہبائی

سرگزشت

عبدالسمیع پال نام، اور اثر صہبائی تخلص ہے۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۰۱ء
کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی احمد دین پال ہے۔
قد و قامت متوسط، چہرہ کتابی اور رنگ سُرخ و سپید ہے۔ عادات
و اخلاق شریفانہ ہیں، اور طبیعت میں ژرف نگاہی پائی جاتی ہے۔
۱۹۱۸ء میں انٹرنس، ۱۹۲۳ء میں بی، اے آنرز، ۱۹۲۵ء
میں ایل، ایل، بی، اور ۱۹۲۹ء میں فلسفے میں ایم، اے، پاس
کیا۔ آج کل وکالت کرتے ہیں۔

۱۲ سال کی عمر سے شعر گوئی کا ذوق ہے۔ فطرت نے عاشقانہ
مذاق عطا کیا ہے۔ ہمیشہ سے خوبصورت انسان، دلکش مناظر اور
تصویریں ان کے لیے جاذبِ قلب و نظر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیشۂ
وکالت کی مصروفیت کے باوجود شعر و سخن کا مشغلہ جاری ہے۔

تین چار سال کی عمر میں والدہ کے آغوشِ شفقت سے محروم
ہوئے، ۱۹۲۷ء میں شادی ہوئی، لیکن ۱۹۳۱ء میں رفیقۂ حیات
کے انتقال سے خانہ ویرانی ہوگئی، اور ۱۹۳۸ء میں والد کا سایہ سر سے

اُٹھ گیا۔ اِن صدمات سے آثر غیر معمولی متاثر ہوئے۔ "راحت کدہ" اِنھیں تاثرات کی یادگار ہے۔

با قاعدہ تلمذ کسی سے نہیں ہے۔ ابتدا میں کبھی کبھی اپنے بڑے بھائی امینِ حزیں کو کلام دکھا لیتے تھے۔ بعد میں بعض مخلص احباب اور ماہرینِ فن سے بھی مشورہ کیا ہے، جن میں سے حضرتِ کیفی اور جنابِ آثر لکھنوی قابلِ ذکر ہیں۔

تصانیف میں "جامِ صہبائی" (مطبوعہ ۱۹۲۶ء) "خمستان" (مطبوعہ ۱۹۳۳ء) اور "جامِ طہور" (مطبوعہ ۱۹۳۷ء) منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

اِن کا خیال ہے کہ شاعری اور دیگر علوم و فنون کی غایت اور مقصدِ کائنات کی صحیح ترجمانی اور تزکیۂ نفس ہے۔ فلسفی، شاعر اور پیغمبر دونوں اپنے اپنے رنگ میں ایک ہی کام انجام دیتے ہیں؛ ان کی راہیں مختلف ہوتی ہیں، لیکن منزل ایک ہے، اس لیے فلسفیانہ شاعری بالفاظِ دیگر، روحانی شاعری ہے، جو شاعری کا سب سے اہم اور ضروری پہلو ہے۔

اُردو ادب کی ترویج و ترقی کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ موجودہ دَور کی جس قدر زندہ زبانیں ہیں اُن کی بہترین کتابوں کے عام فہم ترجمے بیش از بیش کیے جائیں، تاکہ اُردو ادب لطیف میں جوش و سرگرمی کی کمی پوری ہو جائے۔

دیگر زبانوں کے مانوس اور صاف الفاظ خواہ وہ ہندی کے ہوں یا سنسکرت کے، زیادہ سے زیادہ تعداد میں زبان میں داخل کیے جائیں اور عربی کے مشکل الفاظ کی بجائے ہندی کے عام فہم

الفاظ مل سکیں تو اُن کو ترجیح دی جائے ۔ سنسکرت کے صرف وہ الفاظ لیے جائیں، جو موقع کی مناسبت کے لحاظ سے مافی الضمیر کی ترجمانی کرنے میں سہولت پیدا کرسکیں۔

ان کے نزدیک اشعار میں ردیف و قافیہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ نثر سے امتیاز کے لیے وزن کی ضرورت ہے۔

نظم میں علامہ اقبال کو اور غزل میں غالب اور میر کو اُستاد مانتے ہیں۔

اِن کو اساتذہ کے یہ اشعار بہت پسند ہیں:۔

میر	تیرے ایفائے عہد تک نہ جیے
	عمر نے ہم سے بیوفائی کی

〃	زندگی ہے، یا کوئی طوفان ہے؟
	ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مرچلے

غالب	آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
	اب کسی بات پر نہیں آتی

اقبال	تجھے گُر فقر و شاہی کا بتادوں
	غریبی میں نگہبانی خودی کی

انتخابِ کلام

ظلمتِ دشتِ عدم میں بھی اگر جاؤں گا
لے کے ہمراہ یہ داغِ جگر جاؤں گا

عارضِ گُل ہوں، نہ میں دیدۂ بلبل گلچیں
ایک جھونکا ہوں فقط سن سی گزر جاؤں گا

اے فنا! ٹوٹ سکی گی نہ کبھی کشتیٔ عمر
میں کسی اور سمندر میں اُتر جاؤں گا

دیکھ جی بھر کے، مگر توڑ نہ مجھ کو، گل چیں
ہاتھ بھی تو نے لگایا، تو بکھر جاؤں گا

ایک قطرہ ہوں، مگر سیلِ محبت ہے ترے
ہو سکے جو نہ سمندر سی بھی، کر جاؤں گا

دُور گلشن سے کسی دشت میں لیجا، صبا
ہمصفیروں کے ترانوں میں تو مر جاؤں گا

صحنِ گلشن میں کئی دام بچھے ہیں، ای اثر
اُڑ کے جاؤں بھی اگر میں، تو کدھر جاؤں گا

ملی ہے جاں، مگر آرامِ جاں نہیں ملتا
کہیں جہاں میں دلِ شادماں نہیں ملتا

ہجومِ اشک میں گم ہو گیا سفینۂ دل
کرانِ بحرِ غم بے کراں نہیں ملتا

خدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جائے
ہر ایک دل کو غمِ جاوداں نہیں ملتا

وفورِ شوقِ عبادت سی برقِ مضطر ہوں
مری جبیں کو مگر آستاں نہیں ملتا

بنی ہے محفلِ ہستی نگار خانۂ حُسن
تلاش جس کی ہے، اُس کا نشاں نہیں ملتا

نہ چھیڑ بہرِ خدا! صاف صاف کہہ، قاصد
تری نگاہ سے پیرا بیاں نہیں ملتا

ہر ایک نشئے میں مضمر خمار ہے، ساقی
سرور و کیف کہ ہو جاوداں نہیں ملتا

قفس سے چھوٹ کے آیا ہوں ساکنانِ چمن
کہاں ہے؟ مجھکو مرا آشیاں نہیں ملتا

اثر، نوائے پریشاں ہوں بزمِ ہستی میں
کوئی انیس، کوئی رازداں نہیں ملتا

مری ہر سانس کو سب نغمۂ محفل سمجھتے ہیں
مگر اہلِ دل آوازِ شکستِ دل سمجھتے ہیں

گماں کاشانۂ رنگیں کا ہے جس پر نگاہوں کو
اُسے اہلِ نظر گردِ رہِ منزل سمجھتے ہیں

الٰہی کشتیٔ دل بہ رہی ہے کس سمندر میں!
نکل آتی ہیں موجیں ہم جسے ساحل سمجھتے ہیں

طرب انگیز ہیں رنگینیاں فصلِ بہاری کی
مگر بلبل اُنھیں خونِ رگِ بسمل سمجھتے ہیں

پگھل کر دل، لہو ہو کے بہ جاتا ہے آنکھوں سے
ستم ہے، شمع کو جو زینتِ محفل سمجھتے ہیں

کہاں ہوگا ٹھکانا برق رفتارانِ وحشت کا
کہ وہ منزل کو بھی سنگِ رہِ منزل سمجھتے ہیں

بگولے اُڑ رہے ہیں جو ہمارے دشتِ وحشت میں
اُنھیں کو اے اثر، ہم پردۂ محمل سمجھتے ہیں

یا ڈوب جائیں لب مرے موجِ شراب میں
یا موسمِ بہار نہ آئے شباب میں

انگڑائی لیتے اُٹھے جو وہ خوابِ ناز سے
ہر چیز غرق ہو گئی رنگِ شباب میں

ڈوبی ہوئی نگاہ ہے رنگِ حجاب میں
یا کوئی نو شگفتہ کلی نیم خواب میں

جس حُسن کی ہے چشمِ تمنّا کو جستجو
وہ آفتاب میں ہے نہ ہے ماہتاب میں

ہستی کو پھونک دیں گے اثر شعلہائے عشق
خاکِ سیاہ ہو کے رہو گے شباب میں

لطف گناہ میں ملا، اور نہ مزہ ثواب میں
عمر تمام کٹ گئی کاوشِ احتساب میں

تیرے شباب نے کیا مجکو جنوں سے آشنا
میرے جنوں نے بھر دیے رنگ ترے شباب میں

آہ! یہ دل، کہ جاں گداز جوششِ اضطراب ہے
ہائے! وہ دور، جب کبھی لطف تھا اضطراب میں

قلب تڑپ تڑپ اُٹھا، روح لرز لرز گئی
بجلیاں تھیں بھری ہوئی زمزمۂ رباب میں

چرخ بھی مے پرست ہے، بزمِ زمیں بھی مست ہے
غرق بلند و پست ہے جلوۂ ماہتاب میں

میرے لیے عجیب ہیں تیری یہ مسکراہٹیں
جاگ رہا ہوں، یا تجھے دیکھ رہا ہوں خواب میں

میرے سکوت میں نہاں، ہے مرے دل کی داستاں
جھک گئی چشمِ فتنہ زا، ڈوب گئی حجاب میں

لذّتِ جامِ جم کبھی، تلخیٔ زہرِ غم کبھی
عشرتِ زیست ہے، اخترؔ، گردشِ انقلاب میں

تمہاری یاد میں دُنیا کو ہوں بھلائے ہوئے
تمہارے درد کو سینے سے ہوں لگائے ہوئے

عجیب سوز سے لبریز ہیں مرے نغمے
کہ سازِ دل ہے محبت کی چوٹ کھائے ہوئے

جو تجھ سے کچھ بھی نہ ملنے پہ خوش ہیں، اے ساقی
کچھ ایسے رند بھی ہیں میکدے میں آئے ہوئے

تمہارے ایک تبسّم نے دل کو لُوٹ لیا
رہے لبوں پہ ہی شکوے لبوں پہ آئے ہوئے

اخترؔ بھی راہ روِ دشتِ زندگانی ہے
پہاڑ غم کا دلِ زار پر اُٹھائے ہوئے

تمھاری فرقت میں میری آنکھوں سے خوں کے آنسو ٹپک رہے ہیں
سپہرِ الفت کے ہیں ستارے کہ شامِ غم میں چمک رہے ہیں
عجیب ہے سوز و سازِ اُلفت، طرب فزا ہے گدازِ اُلفت
یہ دل میں شعلے بھڑک رہے ہیں، کہ لالہ و گل مہک رہے ہیں
بہار ہے یا شرابِ رنگیں، نشاط افروز، کیف آگیں
گلوں کے ساغر چھلک رہے ہیں، گلوں پہ بلبل چہک رہے ہیں
جہاں پہ چھایا سحابِ مستی، برس رہی ہے شرابِ مستی
غضب ہے رنگِ شبابِ مستی کہ رند و زاہد بہک رہے ہیں
مگر اثر ہے خموش و حیراں، حواس گم، چاک چاک داماں
لبوں پہ آہیں، نظر پریشاں ہے، رُخ پہ آنسو ٹپک رہے ہیں

پھُول اور سِتارہ

میں لالۂ صحرا ہوں، تو عرش کا تارا ہے

چاہوں کہ پہُنچ جاؤں اُڑ کر تری محفل میں
پر میری تگ و دَو کیا کچھ دُور ذرا اُڑ کر
پھر خاک پہ گِر جاؤں گِرتے ہی فنا ہو جاؤں

تو عرش کا تارا ہے، میں لالۂ صحرا ہوں

تیرے لیے ممکن ہے تو چاہے تو بن جائے
قطرہ مئے شبنم کا اور صبحِ بہاراں میں

میرے دلِ سوزاں پر اِک بار برس جائے
نو عرش کا تارا ہے، میں لالۂ صحرا ہوں

دعا

دلِ تاریک کو پُر نور کر دے مری رگ رگ میں برقِ طور بھر دے
مجھے دے شام کے خاموش نغمے مجھے معصوم انوارِ سحر دے
جو تجھکو دیکھ لے ہر ایک شے میں مجھے اپنے کرم سے وہ نظر دے
جلا دے جو خس و خاشاکِ باطل مری آنکھوں کو وہ برق و شرر دے
فلک کے ہر ستم پر مسکرا دوں مجھے وہ ہمّتِ قلب و جگر دے
خزانے میں ترے لاکھوں گُہر ہیں مجھے عشق و محبت کا گُہر دے
مجھے اپنے خمستانِ کرم سے مئے عرفاں کے دو اک جام بھر دے
اثر کی التجا تجھ سے یہی ہے
دعائے صبحگاہی میں اثر دے

مُحبّت کے کرشمے

ستاروں کو میں نے محبت سے دیکھا ستاروں نے بڑھ کر مجھے روشنی دی
جو پھیلا دیا میں نے اُلفت کا دامن چمک مہر نے، چاندنے چاندنی دی

سحر کے پیے میں نے اِک گیت گایا سحر نے مجھے اپنی پاکیزگی دی
جو پھولوں کو چوما تو پھولوں نے ہنسکر مجھے اپنی مستی بھری تازگی دی

نظر بھر کے دیکھا جو روئے شفق کو　　شفق نے مجھے اپنی رنگینیاں دیں
جو جنگل میں گھوما تو خاموشیوں نے　　مجھے اپنی پُر کیف شیرینیاں دیں

محبت سے میں نے کیا ایک سجدہ　　گرا پائے یزداں میں بیہوش ہوکر
اُٹھا کر محبت سے یزداں نے مجکو　　جگہ عرش پر دی، ہم آغوش ہوکر

جب آدھی رات کو دُنیا سکوں کی نیند سوتی ہے
مرا دل تھرتھرا اُٹھتا ہے میری آنکھ روتی ہے
تمھاری یاد آکر چھیڑتی ہے بربطِ دل کو
مرے نغموں میں اک دنیائے غم آباد ہوتی ہے

ہوئے خاموش آغازِ محبت کے حسیں نغمے
کہاں ہیں اب شبابِ عاشقی کے آتشیں نغمے
بس اِک ٹوٹا ہوا دل یادگارِ عشق باقی ہے
کچھ آنسو ہیں، کچھ آہیں اور کچھ اندوہگیں نغمے

اثر لکھنوی

اثر لکھنوی

سرگزشت

میرزا جعفر علی خاں نام، اور اثر تخلص ہے۔ ۱۲ر جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں ولادت ہوئی۔ کٹرۂ ابو تراب میں آبائی مکانات ہیں۔ سلسلۂ نسب حکیم میرزا علی حسین خاں بہادر مخاطب بہ مسیح الدولہ ابن میرزا علی خاں حکیم الملک سے ملتا ہے، جو لکھنؤ کے شاہی اطبّا میں ممتاز ترین شمار کیے جاتے ہیں۔

فارسی کی درسی کتابیں پڑھ کر ۱۸۹۶ء میں جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں انٹرنس پاس کرکے، کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۹۰۴ء میں ایف، اے اور ۱۹۰۶ء میں بی، اے پاس کیا۔ ایک سال، ایم، اے کا کورس پڑھا اور ایل، ایل، بی کی تیاری کی، لیکن طبیعت میں قانون سے مناسبت نہ پاکر یہ سلسلہ چھوڑ دیا۔

۱۹۰۹ء میں صوبۂ متحدہ کی پراونشل سول سروس میں بطور ڈپٹی کلکٹر داخل ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں عراق کا سفر کیا۔ ۱۹۳۵ء میں کلکٹری کے عہدہ پر مستقل ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں "خان بہادر" کا

خطاب ملا۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں ایم ، بی ، ای ، کے خطاب سے مفتخر ہوئے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں پنشن لی ، مگر اس کے بعد ہی قسمتِ الہ آباد کے اڈیشنل کمشنر مقرر ہوئے ، اور یہاں سے ریاستِ کشمیر کے مشیرِ ترقیات کے عہدے پر سرفراز کیے گئے۔ اس وقت کشمیر میں ہوم ممبر ہیں۔

جنابِ اثر درمیانی قد و قامت ، فراخ پیشانی ، اور گندمی رنگ کے خوش فکر شاعر ، نقاد اور ادیب ہیں۔

جناب میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی سے شاعری میں تلمذ ہے۔ فرماتے ہیں:

اثر ہے نام ، وطن لکھنؤ ، عزیز اُستاد
نکالتا ہوں نئے راستے زباں کے لیے

جنابِ اثر نے جن آغوشوں میں پرورش پائی ، وہ زبان کا گہوارہ تھے ، اور بلحاظِ فصاحتِ زبان "ثقاتِ کٹرہ" کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ اسی کا اثر ہے کہ جنابِ اثر کو اپنی زبان سے خاص اُنس ہے ، فرماتے ہیں:۔

صنّاع ، مثلِ آتش ، ہیں میرزا اثر بھی
دیکھو تو جڑ رہے ہیں الفاظ کیا نگیں سے

انگریزی زبان کے فاضل ہیں ، مگر اُردو تحریر یا تقریر میں انگریزی الفاظ بے ضرورت صرف نہیں کرتے۔ شاعری کا ذوق فطری ہے ، اور کلام میں آتش کی طرح زبان کا چٹخارہ اور میر کی طرح جذبات کی فراوانی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

شاعری لطفِ زباں تک نہیں محدود اثر ساتھ ہی ساتھ فراوانیٔ جذبات بھی ہو

میر و غالب دونوں کے دلدادہ ہیں، جیسا کہ اُن کے رنگِ کلام اور اشعارِ ذیل سے واضح ہے:-

اثرؔ ہے میرؔ سے نا دیدہ بیعت ۔۔۔ نہ کیوں تاثیر ہو میرے سخن میں

میرؔ و غالبؔ سے اثرؔ ہے گرمیِ بزمِ سخن ۔۔۔ وہ خدائی کر گیا اور یہ پیمبر ہو گیا

ملازمت کے زمانے میں ادبی ذوق، اور شعر و شاعری کا شغل برابر جاری رہا اور اب بھی بدستور باقی ہے۔

کلام کے دو مجموعے ایک "اثرستان" ۱۹۲۴ء میں اور دوسرا "بہاراں" ۱۹۳۹ء میں طبع ہو چکے ہیں۔

انتخابِ کلام

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجکو

دارِ فانی سے جہاں داغ لیے میں اُٹھّا — یاد آؤں گا بہت، دھیان رہے بس اتنا

دلِ پشیمانِ ستم، آنکھوں میں تصویرِ وفا — کام ہوگا نہ کوئی اور تمھیں اس کے سوا

پوچھو گی شام کے تاروں سے کبھی میرا پتا — موجِ ساحل سے کہو گی کہ ہو دیکھا، تو بتا

دشت کا، جسمیں تپش دفن ہے، ایک اک ذرّا — نقش بن جائیگا میرے ہی دھڑکتے دل کا

دو گی جا جاکے فلک بوس پہاڑوں میں صدا — دیں گے آواز پہ آواز، مگر حاصل کیا

گنگناتی ہوئی گزرے گی اِدھر بادِ صبا — ٹوک کر پوچھو گی، کچھ تو ہی پتا دیتی جا

پاس میں لب پہ مکرر یہ سخن آئے گا — کیا ہوا، کیا ہوا، وہ چاہنے والا میرا

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجکو

خواب سے چونکو گی، کہتی ہوئی، آیا کوئی — لے کے آہستہ مرا نام پکارا کوئی

دلِ بیتاب پہ اک سایہ سا لرزا کوئی — دیکھوں کس طرح؟ کہ ہے محوِ تماشا کوئی

مُسکراتا ہوا آغوش میں لے گا کوئی — جانِ مشتاق! نہ رہ جاتے تمنّا کوئی

سونا بستر کہے گا، اب ہے نہ جب تھا کوئی — آکے سپنے میں ستاتا ہے ستایا کوئی

دل یہ بھر آئیگا، پھوٹے کہیں سوتا کوئی — اشک یوں امڈینگے، ہو جوش میں دریا کوئی

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجکو

ٹوٹ جائیگا یکایک جو کوئی تارِ رباب — سب کہیں گے، اُسی بدبخت کے ہی دل کا جواب

یاد آجائیگا، تم کو کوئی بھولا ہوا خواب — نغمۂ دورِ طرب، ولولۂ عہدِ شباب

صحبتیں جن کا ہر اک لمحہ تھا ہمرنگِ شراب — کیف میں ڈوبی ہوئی، حیف مگر برقِ شباب
داستاں ہجر کی بن جائیگا ہر اشکِ خوش آب — کوئی حسرت کا مرقع، کوئی حرماں کی کتاب

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کروگی مجکو

زیرِ دیوار بچھائے گی چمیلی چادر — گوندھنے بیٹھو گی تم پھولوں کا نازک زیور
ہاتھ یوں کانپیں گے اُسوقت تمہارے تھر تھر — ڈر سمائیگا، نہ ہوں چوڑیاں ٹھنڈی لڑ کر
اور گماں ہوگا یہ مرجھائی ہوئی کلیوں پر — کوئی ہے آہ بلب اور کوئی خاک بسر
ہوگا محسوس تمھیں گور کا میری منظر — جس کا ہر ذرّہ ہے اِک نالۂ محرومِ اثر
برگِ آشفتۂ گل، قطرۂ شبنم سے تر — ہے بہت، آئے جو ہمراہِ صبا وقتِ سحر
یہ تصور کبھی بندھ جائے گا جب پچھلے پہر — تپشِ ہجر سے لَو دے اُٹھے گا تارِ نظر
اور اس تار میں پھول اشکوں کے خود بدھ بدھ کر — دیں گے "پژمردہ تبسّم" پہ نچھاور کی خبر

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کروگی مجکو

مے بدوش آئیگی جس وقت ہوا ساون کی — مست و سرشار جوانی سے پئے سرگوشی
آسماں ہوگا یہی اور زمیں ہوگی یہی — منزلِ مرگ کا ہوں گا فقط اک میں سفری
یاد آئے گی تھیں تنگیٔ آغوش مری — اپنی ہی باہوں کو تم آپ یہ عوت دوگی
ہوگی خواہش کہ ہو بوسوں کی تمنا پوری — مستحق جس کی تھی اِکدن مری شوریدہ سری
ہونٹ تھرّائیں گے ہنسنے میں بناوٹ کی ہنسی — میٹھی چٹکی بنے گی سیج کی ایک ایک کلی

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کروگی مجکو

موجیں گنگا کی وہ مُنھ کھولے ہوئے مثلِ نہنگ — کرتی تھیں ناؤ سے اٹکھیلیاں بے ننگ و درنگ
رات اور ناؤ میں ہم، صلح کبھی اور کبھی جنگ — گھُپ اندھیرے میں فقط پریم کی روشن مردنگ

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجکو

زرفشاں چاندنی سی بامِ فلک جب ہوگا — سازِ انجم پہ مرے نغموں کی گونجے گی صدا
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں پہ یہ ہوگا دھوکا — ڈوبتا کوئی ستارا ہے کسی کا جویا

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجکو

رقص کرتا ہوا لپکے گا بھیانک طوفاں — برق اِدھر قہقہہ زن، رعد اُدھر نعرہ کناں
شور وہ تند ہواؤں کا وہ باد و باراں — جیسے زنجیر تڑاتا ہو کوئی پیلِ دماں
وہ ڈریڑے وہ تھپیڑے کہ بس اللہ کی اماں — جھولا جھولے گی اتاری وہ قیامت کا سماں
اُس پہ وہ رات اندھیری کہ گھٹی جیسے دھواں — واہمہ شکلوں سے آباد کرے گا یہ جہاں
مُنھ سے اک چیخ نکل جائیگی، دل ہوگا تپاں — تم مجھے ڈھونڈو گی، افسوس نہ پاؤ گی نشاں
عافیت بخش جو بازو تھے وہ ہونگے بے جاں — گرم بوسے وہ کہاں؟ دور ہو جن سے خفقاں

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجکو

آبگینے

یاد آگیا پھر اک بتِ رعنا غضب غضب — رنگیں خرام، کیفِ سراپا، غضب غضب
سج دھج نرالی، وضع انوکھی، ادائیں — آواز، جیسے گیت سریلا، غضب غضب
لہجے میں لوچ، لوچ میں وہ نرم زمزمہ — لہرا بجائیں جیسے کنہیا، غضب غضب
آنکھوں میں نیند، نیند میں ڈورا خمار کا — نازک سے آبگینوں میں مینا غضب غضب
وہ پتلیاں کہ مانسرودر کی جھیل میں — سپنوں کی ناؤ کھیتے ہوں ڈولتا غضب غضب
ابرو وہ بانکے، بات پہ تلوار سوت لیں — اور کر دیں ایک دیکھا نہ دیکھا غضب غضب

پلکیں گھنیری، گوپیوں کی ٹوہ کے لیے — رادھا کے جھانکنے کا جھروکا غضب غضب

اور اُن کی اور چھوڑ رہی وہ چپت چور چتونیں — لوٹیں، مگر ذرا جو ہو کھٹکا غضب غضب

اِن بستیوں میں پل کے جواں ہوں جو مستیاں — اُن مستیوں کا کیا ہی ٹھکانا غضب غضب

پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کاجل کہ ہائے ہائے — جیسے کنول کی تاک میں بھونرا غضب غضب

مدھ کی کٹوریوں میں وہ امرت گھلا ہوا — جس کا ہے کام دیو بھی پیاسا غضب غضب

اُن لمبے لمبے بالوں میں گھونگھر کی لہر سی — کروٹ سی جیسی بہتی ہو گنگا غضب غضب

اُن گورے گورے گالوں پر اک لٹ لٹک پڑی — فوراً تھا چہرہ لال بھبھوکا غضب غضب

وہ ہونٹ جن کو چوم رہی تھی شگفتگی — یاقوت اتنا سُرخ نہ چوکھا غضب غضب

وہ چلبلی ادائیں، اداؤں کے ساتھ ساتھ — نتھنوں کا بار بار پھڑکنا غضب غضب

اپنی ہنسی پہ غصّہ، کبھی غصّے پر ہنسی — سونا لٹا دیا، کبھی رو دیا غضب غضب

اُف اُف وہ پور پور میں مہندی رچی ہوئی — ٹیسو کا پھول دیکھا تو ہوگا غضب غضب

اس واسطے "چنگیر" ہتیلی کی دیکھ لوں — انگڑائی توڑنے کا بہانا غضب غضب

بھڑکا رہی تھی حُسن کو گرمی شباب کی
کھنچتا تھا عطر، یا تھا پسینا، غضب غضب

اک تشنہ کامِ شوق کی حسرت بھری نظر — دل بیقرارِ عرضِ تمنا، غضب غضب

جھکے ہوئے سوال کا بہکا ہوا جواب — اُس پر دبا کے ہونٹ وہ کہنا غضب غضب

وہ التفات بخشش بے حد کہیں جسے — پرسش کے بعد بخششِ بے جا غضب غضب

گفتار کوشیٔ لبِ میگوں کے ساتھ ساتھ
شرمندگی، حیا کا تقاضا غضب غضب

بینابیوں نے ہوش سے بیگانہ کر دیا — برہم ہوئی وہ بزمِ تماشا غضب غضب

اوجھل ہوا نگاہ سے وہ جانِ آرزو — محرومیاں ہیں اور دلِ شیدا غضب غضب

جوشِ جنوں میں وہ بھی آخر چاک ہو گیا

ہلکا سا رہ گیا تھا جو پردا غضب غضب

آغازِ محبت کی لذّت انجام میں پانا مشکل ہے

جب دل کو مسوسے رہتے تھے، اب ہاتھ لگانا مشکل ہے

متوالی رسیلی آنکھوں میں نیند ایسی گھنی ہے کہ بس توبہ

فتنے تو اُٹھانا اک جانب، جادو بھی جگانا مشکل ہے

طائر ہے، نہ صیدِ وحشی ہے، دل ہے، البتہ تڑپتا دل

دیکھو تو اِدھر، کوشش تو کرو، کیا ایسا نشانا مشکل ہے

کچھ مشقِ ندامت ہوتی ہے، کچھ عذرِ ستم بھی کرتے رہو

جانوں کے کھپانے والوں کو ہنس ہنس کے رُلانا مشکل ہے

جو عشق کے فن کے ماہر ہیں اُن سے پوچھو، تم کیا جانو

کب اشک بہانا مشکل ہے اور کب پی جانا مشکل ہے

کہنے کو تو ہم آزارکشیدہ کہتے ہیں اِس کو کیا کیا کچھ

انصاف یہ ہے اس جور پہ بھی یوں دل کو لبھانا مشکل ہے

موسم اور وقت کی باتیں ہیں، راتیں ہیں نہ وہ برساتیں ہیں

رونے میں کبھی طوفاں تھے اب دو اشک بہانا مشکل ہے

کہنے اور طول سے کہنے کی حسرت تھی لیکن جب پوچھا
منہ اُس کا تکتے رہ گئے، یعنی حال سُنانا مشکل ہے

میں میرؔ کا دم بھرتا ہوں آخر میں اُس کے کمال کا قائل ہوں
ہاں شعر تو تم کہہ لیتے ہو، وہ بول بنانا مشکل ہے

کوئی اس طرح ساون گا رہا ہے
دلِ ناشاد اُمڈا آ رہا ہے

سُروں میں ڈوبا لہرا بانسری کا
قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہے

ٹھوکے دے رہی ہیں کھیگی تانیں
کلیجا مُنہ کو پیہم آ رہا ہے

پپیہا ٹیرتا ہے کہہ کے "پیو، پیو"
یہ پاپی اور بھی تڑپا رہا ہے

اُدھر آواز میں لگتی ہے پتی
اِدھر دل ہو کہ بیٹھا جا رہا ہے

بھری برسات اور یہ گُھپ اندھیرا
اندھیرا آپ سر ٹکرا رہا ہے

کسی کونپل میں جیسے ڈبوؤ
یونہیں سینے میں دم گھبرا رہا ہے

اندھیری رات میں کوندا لپک کر
دبی جو آگ تھی بھڑکا رہا ہے

اُدھر چنگھاڑتے ہیں مور، اِدھر دل
پچھاڑوں پر پچھاڑیں کھا رہا ہے

چمکتے اب نہیں جگنو ہوا میں
فلک چنگاریاں برسا رہا ہے

مسلسل نغمہ تھی جھینگر کی جھنکار
دل اب آزار جس سے پا رہا ہے

سہاگن رات کا جلنا ہی کاجل
مرا اِک اِک رواں تھرا رہا ہے

یہ رات اور یاد آخر اک بیوفا کی
بس اب رہنے دو، رونا آ رہا ہے

اپنی وفا نہ اُن کی جفاؤں کا ہوش تھا
کیا دن تھے جب کہ دل میں محبت کا جوش تھا

صورت بھی دیکھے اور تری باتیں بھی سُن سکے
گُل چشمِ شوق بن کے طلبگارِ گوش تھا

ہر جلوہ ایک پردہ تھا، ہر دل تھا اک حجاب
بیگانگی کا بزمِ تمنّا میں جوش تھا

سازِ حیات بند تھا، دم تھے رُکے ہوے
اُس جلوہ گاہِ ناز میں جو تھا خموش تھا

ناکامیوں کی باغِ تمنّا میں تھی بہار
گُل ریز داغِ دل تھے، جگر گُل فروش تھا

دونوں کو اِک نگاہ پہ قربان کر دیا
دل جان کا عذاب تھا، سر بارِ دوش تھا

کی صرف ہم نے عمر، سمجھنے میں رازِ عشق
طاعت گزار ہوتے، کہاں اتنا ہوش تھا

احسانِ دانش

۱۳ اپریل ۱۹۸۱ء
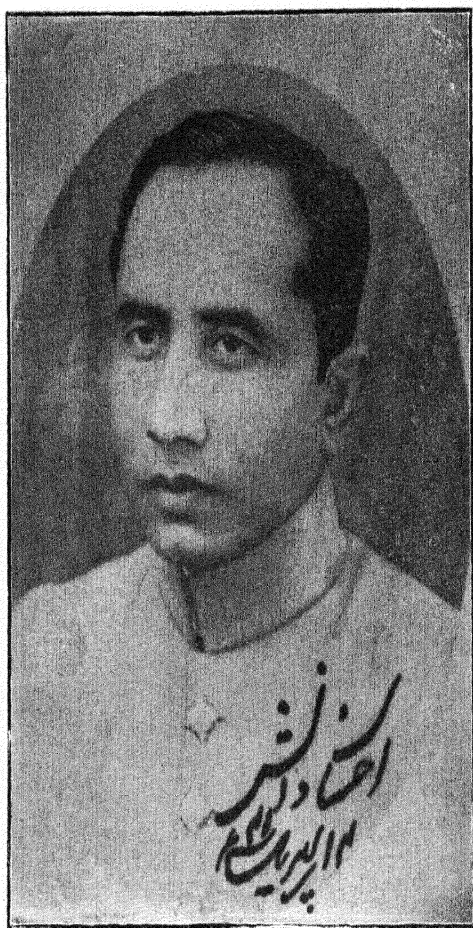
احسان دانش
۱۴ اپریل

احسانِ دانش

سرگزشت

احسان الحق نام، اور احسان تخلص ہے۔ والد کا نام قاضی دانش علی اور خاندانی وطن قصبۂ باغپت ضلع میرٹھ ہے۔ بعض اسباب سے قاضی صاحب نے قصبۂ کاندھلہ، ضلع مظفر نگر، میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ یہیں ۱۹۱۴ء میں احسان پیدا ہوئے۔

قاضی صاحب کے پاس اچھی خاصی جائداد تھی مگر بدقسمتی سے سب کھو بیٹھے، اور بالآخر ایک ٹھیکے دار کے یہاں مزدوروں کے میٹ ہوگئے۔ کبھی کبھی اِنھیں مزدوری بھی کرنا پڑی۔ اُس زمانے میں احسان اپر پرائمری کے تیسرے درجے میں پڑھتے تھے۔ جب تیسرا درجہ پاس کرلیا، تو چوتھے درجے کی کتابوں کے لیے رفیق باپ کو گھر کے تانبے کے برتن فروخت کرنا پڑے۔ لیکن چوتھے درجے کے بعد باپ کے ساتھ مزدوری کرنے پر مجبور ہوگئے، اور تعلیم ترک کردینا پڑی۔ کچھ دنوں کے بعد میونسپلٹی کے چپراسیوں میں جگہ مل گئی۔ یہاں کے افسروں کے بیجا برتاؤ پر ترکِ ملازمت کرکے لاہور چلے گئے، اور سامانِ عمارت ڈھونے والے مزدوروں میں شامل ہوگئے۔

اِن کا اپنا قول ہے کہ:-

"علاوہ دیگر عمارتوں کے دیال سنگھ کالج اور پنجاب
یونیورسٹی کے دفتر پر مزدوری کرنے کا مجھ کو فخر ہے۔"

تاہم اُس زمانے میں بھی دوپہر اور شام کو فرصت کا جتنا وقت ملتا، اُسے کتب بینی میں صرف کرتے۔

کچھ عرصے کے بعد لاہور کی ایک سیرگاہ میں چوکیداروں میں ملازم ہوگئے۔ اس دوران میں تنہائی اور مفت کی روشنی کی بدولت مطالعے کا خوب وقت ملا۔ تھوڑے دنوں کے بعد یہ جگہ تخفیف ہوگئی تو ریلوے کے دفتر کے چپراسیوں میں ملازمت کرلی۔

ریلوے کی نوکری چھوڑ کر گورنمنٹ ہاؤس میں باغبانی کرنے لگے۔ اس کے بعد گیلانی بک ڈپو میں بیس روپے ماہوار کے ملازم ہوے۔ اب عرصے سے اپنا ذاتی کتب خانہ "مکتبۂ دانش" کے نام سے لاہور کے محلۂ مزنگ میں چلا رہے ہیں۔

احسان گہرے سانولے رنگ کے، درمیانہ قد، متین اور سنجیدہ جوان، اور خوش مزاجی، سادگی، انکسار اور تواضع کا مجسمہ ہیں۔ دوست احباب کا دائرہ بھی کافی وسیع ہے۔

شاعری کا آغاز ریلوے کے دفتر کی ملازمت کے زمانے میں ہوا، مگر تلمذ کسی سے نہیں ہے۔

ان کے خیال میں شاعری کا معاشرتی پہلو اہم تر ہے اور زندگی کے جذبات و واقعات کو عام فہم اُردو میں ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ سامعہ نواز بحور میں ادا کرنا اولیٰ ہے۔

احسان ہندی بھی جانتے ہیں، لیکن ہندی کے غیر مانوس الفاظ استعمال نہیں کرتے۔

اساتذۂ متقدمین میں میرؔ کو، متوسطین میں غالبؔ کو، اور دورِ حاضر میں فانیؔ بدایونی کو اُستاد مانتے ہیں، اور نظم میں میر انیسؔ کے مداح ہیں۔

احسان کو دیگر اساتذہ کے یہ اشعار پسند ہیں:۔

میرؔ
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہے گویا چراغ مفلس کا

〃
وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
ڈھونڈھا تھا آسماں نے جنھیں خاک چھان کے

غالبؔ
کرتے کس مُنہ سے ہو غُربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں؟

فانیؔ
فانیؔ، مرے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

〃
موج نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پلٹا
رُخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پائے

اِن کے منظوم کلام کی پانچ جلدیں حسبِ ذیل ناموں سے طبع ہو چکی ہیں:۔

(۱) نوائے کارگر
(۲) چراغاں
(۳) آتشِ خاموش
(۴) جادۂ نو
(۵) نفیرِ فطرت

انتخابِ کلام

کلیر کا عرس

صابر کے درِ پاک کے بے صبر فقیرو
بہروپ ہے، بہروپ، صداقت ہے نہ طاقت
مانا کہ یہ دریوزہ گری ہے تمھیں شایاں
ورثے میں ملی ہے تمھیں غیرت نہ شجاعت

جو مرد ہیں لیکن، وہ گدائی نہیں کرتے

تم دامنِ تہذیب پہ ہو داغِ نجاست

تم شرک کے دلال ہو، بدعت کے نمک خوار
سینوں میں اُجالا ہے نہ روحوں میں حرارت
مبروص عقیدوں میں ہیں مفلوج ارادے
مفلوج ارادوں میں ہے قوموں کی ہلاکت

چہرے ہیں کہ بیمار دماغی کے مرقعے

حلیے ہیں کہ ایمان فروشی کی شہادت

جس صاحبِ عرفاں کا تمھیں نام ہے ازبر
تعلیم ہے اُس مردِ مجاہد کی قناعت
آنکھیں ہیں تو آئینہ اُٹھاؤ کہ تمھارے
بشروں سے نمایاں ہے ضمیروں کی علالت

وہ قوم سرافراز کبھی ہو نہیں سکتی

جس قوم میں ہوتی ہے مزاروں کی تجارت

پُرسشِ غم کا شکریہ، کیا تجھے آگہی نہیں؟

تیرے بغیر زندگی درد ہے، زندگی نہیں

دل کی شکستگی کے ساتھ جنتِ میکدہ گئی

فرصتِ میکشی تو ہے، حسرتِ میکشی نہیں

درد تھا اِک، گزر چکا، نشہ تھا اِک، اُتر چکا
اب وہ مقام ہے، جہاں شکوۂ بے رُخی نہیں

تیرے سوا کروں پسند کیا تری کائنات میں
دونوں جہاں کی نعمتیں قیمتِ بندگی نہیں

اشکِ رواں کی آب و تاب کر نہ عوام میں خراب
عظمتِ عشق کو سمجھ، گریۂ غم ہنسی نہیں

عرصۂ فرصتِ حیات ایسا طویل تو نہ تھا
تم مجھے بھولتے ہو کیوں، میں کوئی اجنبی نہیں

لاکھ زمانہ ظلم ڈھائے، وقت نہ وہ خدا دکھائے
جب مجھے ہو یقیں کہ تو حاصلِ زندگی نہیں

عشرتِ خلد کے لیے زاہدِ کم نظر جُھکے
مشربِ عشق میں تو یہ جُرم ہے، بندگی نہیں

زخم پہ زخم کھائے جی، اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی، عشق ہے دل لگی نہیں

ایک وہ رات تھی کہ جب تھا مرے گھر وہ ماہتاب
ایک یہ رات ہے کہ اب چاند ہے چاندنی نہیں

حیاتِ حُسن میں یوں عشق شامل ہوتا جاتا ہے
جو ذرّہ جگمگاتا ہے، مرا دل ہوتا جاتا ہے

وہ آغازِ جفا تھا، درد کی دل کو شکایت تھی
یہ انجامِ وفا ہے، درد بھی دل ہوتا جاتا ہے

مجھے اے کاش تیری بے رُخی مایوس کر دیتی
مگر مایوس ہو جانا بھی مشکل ہوتا جاتا ہے

مجھے تو ناز تھا ساحل پہ طوفاں آشنائی کا
یہ کیوں ذکرِ سبک سارانِ محفل ہوتا جاتا ہے

یہ کیا سمجھا رہے ہو تم مجھے پردے میں محفل کے
مرا رنگِ تغزل، رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

حضوری میں بھی بیتابی ہے دوری میں بھی بیتابی
سکونِ دل بہر تقدیر مشکل ہوتا جاتا ہے

محبت میں مکان و لامکاں ہیں دو قدم لیکن
مجھے یہ دو قدم چلنا بھی مشکل ہوتا جاتا ہے

ستارے ڈوبتے جاتے ہیں شمعیں بجھتی جاتی ہیں
مرتب خود بخود انجامِ محفل ہوتا جاتا ہے

بہت دن سر دُھنا ہے جُرمِ آغازِ محبت پر
اور اب انجام سے احسان غافل ہوتا جاتا ہے

ایک ٹھیکیدار سے خطاب

زر کے بل بوتے پہ مزدوروں سے اتنا اجتناب
گفتگو کی ہر ادا بیگانۂ آداب ہے
فقرے فقرے سے ٹپکتا ہے اخوت کا لہو
گرم پلکوں میں مروت کی لچک نایاب ہے
عشرتوں کی چند نازک ساعتوں پر یہ غرور
یہ تو اک اندھے شرابی کا سہانا خواب ہے

رعنائیِ کونین سے بیزار ہمیں تھے
ہم تھے ترے جلووں کے طلبگار ہمیں تھے

پتھر کبھی گلیوں پہ برستے تھے ہمیں پر
دیوانہ گرِ کوچہ و بازار ہمیں تھے

ہے فرق طلبگار و پرستار میں اے دوست
دنیا تھی طلبگار پرستار ہمیں تھے

اِس بندہ نوازی کے تصدق سرِ محشر
گویا تری رحمت کے سزاوار ہمیں تھے

دی دے کے نگاہوں کو تصور کا سہارا
راتوں کو ترے واسطے بیدار ہمیں تھے

پچھتاؤ گے، دیکھو ہمیں بیگانہ سمجھ کر
مانو گے کسی وقت کہ غمخوار ہمیں تھے

بازارِ ازل یوں تو بہت گرم تھا لیکن
لے دے کے محبت کے خریدار ہمیں تھے

ہاں آپ کو دیکھا تھا محبت سے ہمیں نے
جی، سارے زمانے کے گنہگار ہمیں تھے

احسان ہے بے سود گلہ اُن کی جفا کا
چاہا تھا اُنھیں ہم نے، خطاوار ہمیں تھے

سنور کے بزمِ ازل میں جو زندگی آئی
قضا کے ہونٹوں پہ بیساختہ ہنسی آئی

بڑی جفائیں اٹھائیں، بڑے ستم جھیلے
بہت دنوں میں رہ و رسمِ عاشقی آئی

نصیب عشق نہ ہوتا تو خام رہ جاتا
طبیعت آپ پہ آئی تو بندگی آئی

جنوں سرشتِ بشر میں نہیں تو کیوں آخر
قضا پکڑ کے گریبانِ زندگی آئی

چمن میں گریۂ شبنم غلط سہی لیکن
سوال یہ ہے کہ پھولوں کو کیوں ہنسی آئی

کسی کا وعدۂ فردا ارے معاذ اللہ
جھمک جھمک کے ستاروں میں روشنی آئی

نہ مجھ سے خوش نظر آتے ہیں وہ نہ کچھ ناراض
بڑے عذاب میں احسان زندگی آئی

میرے اشکِ غم کی تابانی بڑھاتے جائیے
مسکراتے جائیے، ہاں مسکراتے جائیے

کس لیے بچنے کی زحمت ہو نگاہِ مست کو
سامنے جو آئے، دیوانہ بناتے جائیے

ہاں مری آنکھوں سے اوجھل ہو چلی ہے کائنات
ہاں اسی رفتار سے نزدیک آتے جائیے

آپ اگر تشریف لیجاتے ہیں، لیجائیں مگر
میری آنکھوں کے چراغوں کو بجھاتے جائیے

اے معاذ اللہ مری محبوبیوں کی زندگی
زخم کھاتے جائیے، اور مسکراتے جائیے

عمر ہو جائے گی احسان ایک دن یونہی تمام
دوست بنتے جائیے، دشمن بناتے جائیے

سادھو کی چتا

ہمنشیں، کشمیر سے لاہور کو آتے ہوئے
اک سماں دیکھا جگر پر نیشِ غم کھاتے ہوئے

گر چکا تھا طاقِ مغرب سے چراغِ آفتاب
بند تھی جزدانِ تاریکی میں فطرت کی کتاب

ظلمتیں گردوں کی کالی جھیل میں چھلکی ہوئی
جھکڑوں سے ٹہنیوں کی گردنیں ڈھلکی ہوئی

لحظہ لحظہ تیرہ تر ہوتی فضائے سُرمگیں — سنگ پاروں پہ اُچٹتی بوندیاں، گیلی زمیں

ابر کے دامن میں کوندی کی لپک حبشیوں کا شور — ہلکی ہلکی بوندیوں کا سلسلہ جھلّوں کا زور

دور وادی میں کہیں مدھم سا دہقانوں کا غل — تیز نالے پر گزرنے کے لیے لکڑی کا پُل

پُل کی اِک دیوار کے نیچے قریبِ رہگزر — ایک سادھو کی چِتا تصویرِ انجامِ بشر

بوندیوں میں آگ کا پرتو، چٹانوں پر جھلک — مست بادل کی گرج سے کوہساروں میں دھمک

آگ کے خونخوار جبڑوں سے دُھواں اُٹھتا ہوا — پیچ و خم کھا کر زمیں سے آسماں اُٹھتا ہوا

ہر طرف بھیگے ہوئے پیڑوں کے پتے سوگوار — خوف سے ٹھنڈی ہوا کو ہلکا ہلکا سا بخار

کھولتا سینہ، سُلگتی کھوپڑی، پکتا بدن — تڑتڑاتی آگ، جھلّاتی لپٹ، جلتا کفن

ٹوٹتی نبضیں، چٹختی ہڈیاں، اُڑتے شرر — لوتھڑوں کی سنسناہٹ، سُرخ شعلونکی ڈکار

ہونکتے جھونکوں کے آگے، چونکتی چنگاریاں — بولتے شعلوں کی لہراتی ہوئی نیلی زباں

ہر طرف لہرا رہا تھا بے ثباتی کا علم
موت کی دیوی کے خونیں قہقہوں کا زیر و بم

میرے قصرِ زندگی میں زلزلہ سا آ گیا — روح کے آئینہ خانے میں دُھندلکا چھا گیا

بزمِ عشرت اُٹھ گئی طنبورِ غم بجنے لگا — ضربتِ تشویش سے سازِ الم بجنے لگا

عبرت اُٹھی، آرزو بیٹھی، تمنا سو گئی — یاس نے انگڑائی لی، امید زخمی ہو گئی

رات بھر میرے دلِ محزوں کو بیتابی رہی — خواب پر غالب پریشانی سے بیخوابی رہی

اب بھی وہ منظر کبھی جب یاد آتا ہے مجھے
زندگی میں موت کا نقشہ دکھاتا ہے مجھے

اختر شیرانی

۲۴ دسمبر ۱۹۴۰ء

اختر شیرانی

نہ بھول کر بھی تمنائے رنگ و بو کرتے
چمن کے پھول اگر تیری آرزو کرتے !

مسرّت ! آہ تو بستی ہے کن ستاروں میں !
زمیں پہ عمر ہوئی تیری جستجو کرتے !

ایاغ بادہ میں آکر وہ خود چھلک پڑتا
گر اُس کے رند ذرا اور ہاؤ ہو کرتے !

اُنھیں مفر نہ تھا اقرارِ عشق سے ، لیکن ،
حیا کو ضد تھی کریں پاسِ آبرو کرتے !

جنابِ شیخ پہنچ جاتے حوضِ کوثر تک
اگر شراب سے میخانے میں وضو کرتے

پکار اُٹھتا وہ آکر دلوں کی دھڑکن میں
ہم اپنے سینوں میں گر اُسکی جستجو کرتے

جنونِ عشق کی تاثیر تو یہ تھی اختر
کہ ہم نہیں وہ خود اظہارِ آرزو کرتے !

اختر شیرانی

ریاست رامپور۔

اختر شیرانی

سرگزشت

اختر خاں نام، اور اختؔر تخلص ہے۔ ۱۹۰۵ء میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ محمود خاں شیرانی اور دادا کا نام محمد اسمٰعیل خاں شیرانی ہے۔

پروفیسر شیرانی، جن کی تنقیدی نظر مستشرقینِ یورپ سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے، ۱۹۱۹ء میں ٹونک چھوڑ کر لاہور چلے آئے تھے۔ یہیں اختؔر نے ہوش سنبھالا اور یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں اورینٹل کالج میں داخل ہو کر منشی فاضل پاس کیا۔ ۱۹۲۲ء میں ادیبِ فاضل کی ڈگری لی۔ اِس کے بعد رسالۂ ہمایوں کی ادارت میں شریک ہو گئے۔ پھر ایک دوست کے کہنے پر "بہارستان" نکالا۔ کچھ عرصے کے بعد جنونِ عشق کے ہاتھوں اُسے بھی خیرباد کہدیا۔ چند سال بعد اورینٹل کالج سے میٹرک میں بھی شریک ہوئے۔

شعر و شاعری سے اختؔر کو فطری لگاؤ ہے اور لڑکپن سے شعر کہتے ہیں۔ ابتدا میں اپنے اتالیق صابر علی خاں شاکر سے کچھ دن مشورہ کیا تھا۔ بعد ازاں ذوقِ فطری سے مدد لیتے رہے، اور رفتہ رفتہ

اُردو کے ممتاز شاعروں میں گنے جانے لگے۔

اختر کا درمیانی قد، اور سانولا رنگ ہے۔ پیشانی کشادہ، چہرہ آفتابی اور آواز میں دلکشی ہے، لیکن کسی مشاعرے میں لحن و ترنم کے ساتھ کلام نہیں پڑھتے۔

طبیعت میں شوخی اور رنگینی ہے، اور مناظرِ قدرت سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ اہلِ مذاق کے یارِ شاطر ہیں، اور پُر خلوص محبت کرتے ہیں۔ بےحد بے پروا اور بےباک واقع ہوے ہیں۔ نہ کسی پابندی سے نظم کرتے ہیں، اور نہ کسی مجبوری سے نثر لکھتے ہیں۔ ان کے خیالاتِ منثور اور جذباتِ منظوم سود و زیاں کی نیازمندانہ قیود سے آزاد ہیں۔

اقسامِ شاعری کے متعلق حسبِ ذیل اظہار خیال کیا ہے:۔

"شعر سے تو بہت سے کام لیے جا سکتے ہیں، لیکن میرے نزدیک شاعری ایک وہ جذبہ ہے، جو عاشقانہ تنہائیوں کی پیداوار اور اُنھیں کے لیے باعثِ مسرت ہیں۔ میں جذباتی شاعر ہوں اور اِسی قسم کے اشعار کہنا پسند کرتا ہوں"

اُردو ادب کی ترویج و ترقی کے بارے میں اِن کی رائے ہے کہ اول "اُردو" مدارس میں لازمی کی جائے، دوسرے اُردو پڑھنے والے زیادہ پیدا کیے جائیں اور تیسرے اچھے مصنفین کی قدر کی جائے۔

اِن کے نزدیک اُردو میں ہندی اور سنسکرت کے اُن الفاظ کے شمول میں مضائقہ نہیں جن سے ہماری زبان کی فصاحت، موسیقی اور لطافت میں فرق نہ آئے۔

ردیف و قافیہ کی پابندی میں چونکہ ایک ناقابلِ بیان موسیقی اور

تاثیر ہے، اس لیے اشعار میں اِن کا ہونا لازم جانتے ہیں۔

دیگر شعرا کے یہ اشعار اِن کو پسند ہیں:۔

ساعد سیمیں دونو اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیے	بھولے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا
کیفیتِ چشم اِس کی مجھے یاد ہے سودا	ساغر کو مرے ہاتھ سے لے کہ چلا میں
آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے، انداز تو دیکھو	ہے بوالہوسوں پر بھی ستم، ناز تو دیکھو
تم کو ہزار شرم سہی، مجھکو لاکھ ضبط	اُلفت، وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائیگا
جلوہ دیکھا تری رعنائی کا	کیا کلیجہ ہے تماشائی کا
بُھلاتا لاکھ ہوں لیکن وہ اکثر یاد آتے ہیں	الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں
مجھے اُٹھانے کو آیا ہے واعظِ ناداں	اُٹھا سکے تو مرا ساغرِ شراب اُٹھا

اِن کا خیال ہے کہ نظموں کی ابھی ابتدا ہے، اِس لیے آگے چل کر کوئی ایسا شاعر پیدا ہوگا جس کو "اُستاد" کہا جا سکے۔ غزل میں میرؔ، دردؔ، داغؔ، مولانا حسرتؔ، اور جگرؔ کو بہتر سمجھتے ہیں۔

اِن کے منظوم کلام کے حسبِ ذیل مجموعے طبع ہو چکے ہیں:۔

(۱) پھولوں کا گیت (بچوں کے لیے)،

(۲) نغمۂ حرم (عورتوں کے لیے)،

(۳) صبحِ بہار (عام نظموں کا مجموعہ)۔

آج کل انجمنِ ترقئ اُردو کا کچھ کام اپنے وطن (ٹونک) میں کر رہے ہیں۔

انتخابِ کلام

اُس کے عہدِ شباب میں جینا — جینے والو تمھیں ہوا کیا ہے
حوریں نیکوں میں بٹ چکی ہوں گی — باغِ رضواں میں اب دھرا کیا ہے
اِک محبت تھی مِٹ چکی یارب — تیری دُنیا میں اب رکھا کیا ہے

جھوم کر بدلی اُٹھی اور چھا گئی — ساری دنیا پر جوانی آگئی
پارسائی کی جواں مرگی نہ پوچھ — توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھا گئی
سازِ دل کو گدگدایا عشق نے — موت کو لے کر جوانی آگئی

مستانہ پیے جا، یوں ہی مستانہ پیے جا — پیمانہ تو کیا چیز ہے میخانہ پیے جا
کشکول ہو یا ساغرِ جم، نشہ ہے یکساں — شاہانہ پیے جا کہ فقیرانہ پیے جا
کر غرقِ مے و جام غمِ گردشِ ایام — ہاں اے دلِ ناکام حکیمانہ پیے جا

او! دیس سے آنے والے بتا!

او! دیس سے آنے والے بتا — کِس حال میں ہیں یارانِ وطن؟
آوارۂ غربت کو بھی سُنا — کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن؟
وہ باغِ وطن فردوسِ وطن — وہ سروِ وطن ریحانِ وطن؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں — مستانہ ہوائیں آتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر — گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں — ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی — سرمست نظارے ہوتے ہیں؟
کیا اب بھی سہانی راتوں کو — وہ چاند ستارے ہوتے ہیں؟
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے — کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی شفق کے سایوں میں — دن رات کے دامن ملتے ہیں؟
کیا اب بھی چمن میں ویسے ہی — خوش رنگ شگوفے کھلتے ہیں؟
برساتی ہوا کی لہروں سے — بھیگے ہوئے پودے ہلتے ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا

شاداب و شگفتہ پھولوں سے — معمور ہیں گلزار اب کہ نہیں؟
بازار میں مالن لاتی ہے — پھولوں کے گندھے ہار اب کہ نہیں؟

اور شوق سے ٹوٹے پڑتے ہیں
نوخیز خریدار اب کہ نہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا شام پڑے سڑکوں پہ وہی
دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے؟
اور گلیوں کی دھندلی شمعوں پر
سایوں کا بسیرا ہوتا ہے؟
باغوں کی گھنیری شاخوں میں
جس طرح سویرا ہوتا ہے؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں ویسے ہی جواں
اور مدھ بھری راتیں ہوتی ہیں؟
کیا رات بھر اب بھی گیتوں کی
اور پیار کی باتیں ہوتی ہیں؟
وہ حسن کے جادو چلتے ہیں
وہ عشق کی گھاتیں ہوتی ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
ویرانیوں کے آغوش میں وہ
آباد ہے بازار اب کہ نہیں؟
تلواریں بغل میں دابے ہوئے
پھرتے ہیں طرحدار اب کہ نہیں؟
اور بہلیوں میں سے جھانکتے ہیں
ترکانِ سیہ کار اب کہ نہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی مہکتے مندر سے
ناقوس کی آواز آتی ہے؟

کیا اب بھی مقدس مسجد پر — مستانہ اذاں تھراتی ہے؟
اور شام کے رنگیں سایوں پر — اِک عظمت سی چھا جاتی ہے؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر — پنہاریاں پانی بھرتی ہیں؟
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر — ماتھے پر گاگر دھرتی ہیں؟
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے — ہنستے ہوئے چہلیں کرتی ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
برسات کے موسم اب بھی وہاں — ویسے ہی سہانے ہوتے ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں — جھولے اور گانے ہوتے ہیں؟
اور دور کہیں کچھ دیکھتے ہی — نوعمر دوانے ہوتے ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی پہاڑی چوٹیوں پر — برسات کے بادل چھاتے ہیں؟
کیا اب بھی ہوائے ساحل کے — وہ رس بھرے جھونکے آتے ہیں؟
کیا رسیا کی اونچی ٹیکری پر — لوگ اب بھی وہ بتیں گاتے ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی پہاڑی گھاٹیوں میں
گھنگھور گھٹائیں گونجتی ہیں؟
ساحل کے گھنیرے پیڑوں میں
برکھا کی ہوائیں گونجتی ہیں؟
جھینگر کے ترانے جاگتے ہیں
موروں کی صدائیں گونجتی ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا

کیا نوگزے کے میلوں میں وہی
برسات کا جوبن ہوتا ہے؟
پھیلی ہوئی بڑ کی شاخوں میں
جھولوں کا نشیمن ہوتا ہے؟
اُمڈے ہوئے بادل ہوتے ہیں
چھایا ہوا ساون ہوتا ہے؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا

کیا شہر کے گرداب بھی ہیں رواں
دریائے حسیں لہرائے ہوئے؟
جوں گود میں اپنے من کو لیے
ناگن ہو کوئی تھرائے ہوئے؟
یا نور کی ہنسلی حور کی گردن
میں ہو عیاں بل کھائے ہوئے؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی فضا کے دامن میں
برکھا کے سمے لہراتے ہیں؟
کیا اب بھی کنارِ دریا پر
طوفان کے جھونکے آتے ہیں؟

کیا اب بھی اندھیری راتوں میں — ملّاح ترانے گاتے ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں برسات کے دن — باغوں میں بہاریں آتی ہیں؟
معصوم و حسیں دوشیزائیں — برکھا کے ترانے گاتی ہیں؟
اور تیتریوں کی طرح سے — رنگیں جھولوں پر لہراتی ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی اُفق کے سینے پر — شاداب گھٹائیں جھومتی ہیں؟
دریا کے کنارے باغوں میں — مخمور ہوائیں جھومتی ہیں؟
اور اُن کے نشیلے جھونکوں سے — خاموش فضائیں جھومتی ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی شام کو جاتے ہیں — احباب کنارِ دریا پر؟
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں — شاداب کنارِ دریا پر؟
اور پیار سے آکر جھانکتا ہے — مہتاب کنارِ دریا پر؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا آم کے اونچے پیڑوں پر — اب بھی وہ پپیہے بولتے ہیں؟

شاخوں کے حریری پردوں میں نغموں کے خزانے کھولتے ہیں؟
ساون کے رسیلے گیتوں سے تالاب میں امرس گھولتے ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا پہلی سی ہے معصوم ابھی وہ مدرسے کی شاداب فضا؟
کچھ بھولے ہوئے دن گزرے ہیں جس میں، وہ مثالِ خواب فضا
وہ کھیل، وہ ہم سِن، وہ میداں وہ خواب گہِ مہتاب فضا
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی کسی کے سینے میں باقی ہے ہماری چاہ؟ بتا
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب یاروں میں کوئی آہ؟ بتا
او دیس سے آنے والے بتا لِلّٰہ! بتا، لِلّٰہ؟ بتا
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا ہم کو وطن کے باغوں کی مستانہ فضائیں بھول گئیں؟
برکھا کی بہاریں بھول گئیں؟ ساون کی گھٹائیں بھول گئیں؟
دریا کے کنارے بھول گئے؟ جنگل کی ہوائیں بھول گئیں؟

او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا

کیا گاؤں میں اب بھی ویسی ہی
مستی بھری راتیں آتی ہیں؟
دیہات کی کم سن ماہ وشیں
تالاب کی جانب جاتی ہیں؟
اور چاند کی سادہ روشنی میں
رنگین ترانے گاتی ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی گجر دم چرواہے
ریوڑ کو چرانے جاتے ہیں؟
اور شام کو دھندلے سایوں کے
ہمراہ گھروں کو آتے ہیں؟
اور اپنی رسیلی بانسریوں
میں عشق کے نغمے گاتے ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا

کیا بھابی پہ اب بھی ساون میں
برکھا کی بہاریں چھاتی ہیں؟
معصوم گھروں سے بھور بھٹے
چکّی کی صدائیں آتی ہیں؟
اور یاد میں اپنے میکے کی
بچھڑی ہوئی سکھیاں گاتی ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا

گنگراج کا خواب آلودہ سا گھاٹ
اور اُس کی فضائیں کیسی ہیں؟
وہ باغ، وہ بنگلہ، وہ تالاب
اور اُس کی ہوائیں کیسی ہیں؟

وہ کھیت، وہ گاؤں، وہ چڑیاں — اور اُن کی صدائیں کیسی ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی پُرانے کھنڈروں پر — تاریخ کی عبرت طاری ہے؟
ان پُونا کے اُجڑے مندر پر — مایوسی و حسرت طاری ہے؟
سنسان گھروں پر چھاؤنی کے — ویرانی و رِقّت طاری ہے؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
آخر میں یہ حسرت ہے کہ بتا — وہ غارتِ ایماں کیسی ہے؟
بچپن میں جو آفت ڈھاتی تھی — وہ آفتِ دوراں کیسی ہے؟
ہم دونوں تھے جس کے پروانے — وہ شمعِ شبستاں کیسی ہے؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
مرجانہ تھا جس کا نام، بتا — وہ غنچہ دہن کس حال میں ہے؟
جس پر تھے فدا طفلانِ وطن — وہ جانِ وطن کس حال میں ہے؟
وہ سروِ چمن، وہ رشکِ سمن — وہ سیم بدن کس حال میں ہے؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی رُخِ گلرنگ پہ وہ — جنّت کے نظارے روشن ہیں؟

کیا اب بھی رسیلی آنکھوں میں
اور اُس کے گلابی ہونٹوں پر

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی شہابی عارض پر
یا بحرِ شفق کی موجوں پر
اور جن کی جھلک سے ساون کی

او! دیس سے آنے والے بتا
اب نامِ خدا ہو گی وہ جواں
دوشیزہ ہے، یا آفت میں اُسے
گھر پر ہی رہی، یا گھر سے گئی؟

ساون کے ستارے روشن ہیں؟
بجلی کے شرارے روشن ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

گیسوے سیہ بل کھاتے ہیں؟
دو ناگ پڑے لہراتے ہیں؟
راتوں کے سے سپنے آتے ہیں
او! دیس سے آنے والے بتا

میکے میں ہے، یا سسرال گئی؟
کمبخت جوانی ڈال گئی؟
خوش حال رہی، خوش حال گئی؟
او! دیس سے آنے والے بتا

۲۳ دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء

امین حزیں
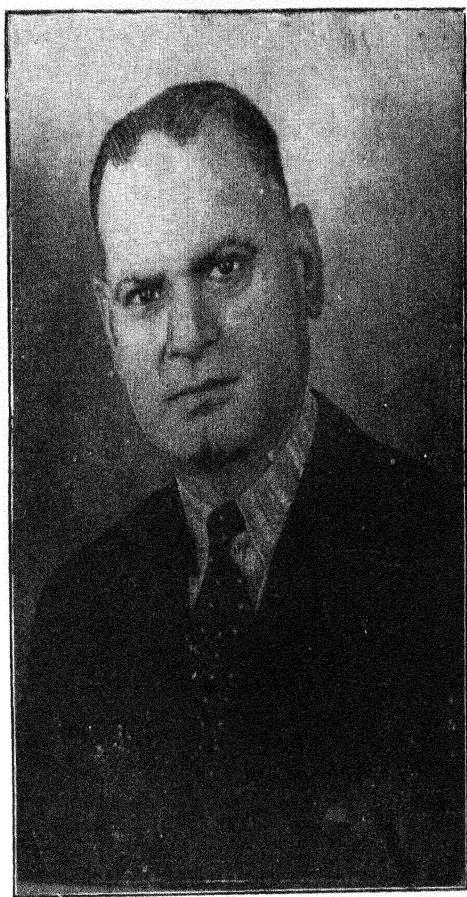
غزل

بے بسی اختیار کیا جائے! زرد پتّی بہار کیا جائے!

شاخ جو ہو چلی ہو خاک نشیں شوکتِ برگ و بار کیا جائے!

تار تار اس کا جیب کر ڈالے کوئی حرفِ مطلب سنار کیا جائے!

اتنے آنسو کہاں سے آئے ہیں دیدۂ اشکبار کیا جائے!

شوق کے پانو دشت پا ہیں آبلے کیوں ہیں؟ خار کیا جائے

عندلیبِ اسیر بیچاری نغمۂ نو بہار کیا جائے

خود گری کا مقام ہے یہ امین

خود فریبی وقار کیا جائے

محمد امین حزیں سیالکوٹی
بقلم خود
بمقام رامپور اسٹیٹ
23.12.1941

امینِ حزیں

سرگزشت

خواجہ محمد مسیح پال نام، امینؔ حزیں تخلص، سالِ پیدائش ۱۸۸۴ء،
مقامِ ولادت سیالکوٹ، اور والد کا نام مولوی احمد دین ہے۔

امینؔ حزیں نے عربی و فارسی شمس العلماء مولوی امیر حسن (اُستادِ علامہ اقبال) سے پڑھی، اور انگریزی کی تعلیم اول مشن ہائی اسکول اور بعدہٗ مشن کالج سیالکوٹ میں پائی۔

پہلے ڈاکٹر بننے کا شوق ہوا؛ لیکن سائنس سے طبیعت کو مناسبت نہ تھی، اِس لیے ملازمت کر لی۔ کچھ عرصہ ہوا کہ انڈین اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنسی گلگت سے خان بہادر کا خطاب لے کر پنشن پائی ہے۔

ملازمت کے دوران میں بھی علمی مشاغل برابر جاری رہے۔ اب ہمہ تن اُردو ادبیات کی خدمت میں مصروف ہیں۔

شعر و سخن کی طرف طبیعت کا رجحان ابتدا ہی سے تھا؛ لیکن سنہ ۱۹۰۲ء سے یہ مشغلہ برابر جاری ہے۔

ابتدائے شعر گوئی میں مولوی ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی جوہر

مرحوم کے رنگ سے متاثر تھے۔ بعد ازاں علامہ اقبال کو پسند کرنے لگے،
اور یہ رنگ کچھ ایسا بھایا کہ پھر کسی کا نقشہ نہ جم سکا۔

امینِ حزیں متوسط قامت، پُر گوشت اور گورے رنگ کے
خوبصورت انسان ہیں، کشادہ پیشانی سے فراخیٔ حوصلہ، بلند خیالی اور
خوش اخلاقی ٹپکتی ہے، اور باتوں سے عالی ہمتی، قلب کی صفائی اور
فکر کی گہرائی کا پتا چلتا ہے۔

اِن کے کلام کو گل و بلبل، لیلیٰ و مجنوں، وامق و عذرا، اور
شبِ ہجراں کے افسانہ ہائے دراز سے دُور کا تعلق بھی نہیں۔ یہ
اصلاحی، اخلاقی اور خطیبانہ شاعری کے علم بردار ہیں۔

اُردو زبان کی ترقی و توسیع کے بارے میں اِن کا خیال ہے
کہ بلند پایہ علمی اور اخلاقی کتابوں کے بکثرت ترجمے کیے جائیں اور مستقل
کتابیں، مفید اور دلچسپ مضامین پر لکھی جائیں، نیز قدرتِ زبان
اور لطافتِ شاعرانہ کے ساتھ مؤثر انداز میں پاکیزہ اور بلند خیالات
نظم کرنے کی اہلیت پیدا کرلی جائے، تو اُردو کو وہی شرف حاصل
ہوسکتا ہے، جو دیگر ترقی یافتہ زبانیں پاچکی ہیں۔

ہندی اور سنسکرت کے ساتھ جملہ دیگر زبانوں کے الفاظ بھی اُردو
زبان میں شامل کیے جانے کے حامی ہیں، بشرطیکہ وہ غیر الفاظ اِس
ترکیب سے استعمال کیے جائیں کہ اُن کو اپنا لیا جاسکے۔

ردیف و قافیہ کی پابندی کے متعلق اِن کا خیال ہے کہ موجودہ
شاعر توجہ سے کام نہیں لیتے اور انگریزی شاعری کے اتباع میں
ردیف و قافیہ کی پابندی سے گریز کرتے ہیں، حالانکہ اِس قسم کی

شاعری برہنہ شاعری ہے۔ ایشیائی شاعری میں ردیف و قافیہ کی پابندی ضروری ہے۔ جب تک ردیف و قافیہ نہ ہوگا، موسیقیت پیدا نہیں ہوسکتی، جو ایشیائی شاعری کا جزوِ لاینفک ہے۔

دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار کے سلسلے میں ظاہر کیا کہ مجھ کو علامہ اقبال کا کل کلام پسند ہے اور برجستہ یہ شعر پڑھا:-

خودی کو کر بلند اِتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

نظم میں علامہ اقبال کو اور غزل میں میرزا غالب کو اُستاد مانتے ہیں۔ اِن کے کلام کا ایک مجموعہ "گلبانگِ حیات" کے نام سے طبع ہوچکا ہے۔

انتخابِ کلام

مردِ مومن کی شان پیدا کر — اے کفِ خاک، جان پیدا کر
ہے خطابِ تخلقوا کس سے — آپ اپنا جہان پیدا کر

پردگی موت ہے شہود ہے زیست — جوہرِ پاک کی نمود ہے زیست
ہر شجر کی زبانِ حال سے سن — روز و شب مائلِ صعود ہے زیست

جس میں بیتابیٔ نمود نہیں — زیست وہ درخورِ شہود نہیں
اس کی بود و نبود اسکا عمل — زندگی کا کوئی وجود نہیں

لالے پڑے ہیں جان کے، جینے کا اہتمام کر — جن میں ہو کیفِ زندگی بہرِ خدا وہ کام کر
طورِ حیات سے اڑا، جذبۂ زیستن کی آگ — جب کہیں جا کے نیتِ زندگیٔ دوام کر
پہلے یہ سوچ دام کے توڑنے کی سکت بھی ہے — بعد کو دل میں خواہشِ دانۂ زیرِ دام کر
تجھ کو تری ہی آنکھ سے دیکھ رہی ہے کائنات — بات یہ راز کی نہیں، اپنا خود احترام کر
حیف سمجھ رہا ہے تو اپنی جھجک کو محتسب — میکدۂ حیات میں شوق سے مے بجام کر
نقشِ نوی نہیں ہے تو صفحۂ روزگار پر — مٹنے سے گر نہیں مفر مٹ کے ہی اپنا نام کر

بندۂ خواہشات کو کہتا ہے کون عبدِ حر
چاہیے حریت اگر دل کو، آئیں غلام کر

یوں دل ہے سر بسجدہ کسی کی حضور میں — جیسے کہ غوطہ زن ہو کوئی بحرِ نور میں

ہنس ہنس کے کہہ رہی ہے چمن کی کلی کلی — آتا ہے لطف حُسن کو اپنے ظہور میں

ساقی نگاہِ مست سے دیتا ہے جب کبھی — لگتے ہیں چار چاند ہمارے سرور میں

کھائیں جنابِ شیخ فریبِ قیاس و وہم — یہ کیفِ جاں نواز کہاں چشمِ حور میں

مثلِ کلیم کون سُنے لن ترانیاں — میرے لیے کشش ہی کہاں کوہِ طور میں

بیش از دو حرف اپنی نہیں داستانِ درد — ہم گر کے آسمان سے اٹکے کھجور میں

یہ شوخیاں کلام میں یونہی نہیں اؔمین
پڑھنے چلے ہیں آپ غزل رام پور میں

افسانۂ حیات کو دُہرا رہا ہوں میں — یوں اپنی عمرِ رفتہ کو لوٹا رہا ہوں میں

اِک اِک قدم پہ درسِ وفا دے رہا ہوں میں — یہ کس کی جستجو ہے کدھر جا رہا ہوں میں

یارب کسی کا دامِ حسیں منتظر نہ ہو — پُر شوق کے لگے ہیں اُڑا جا رہا ہوں میں

اِس سحرِ رنگ و بو نے تو دیوانہ کر دیا — دامن کے تار تار کو اُلجھا رہا ہوں میں

سوزِ درونِ سینہ کو نغموں میں ڈھال کر — سازِ نفس کے تار کو برما رہا ہوں میں

راہِ طلب میں دیکھ مرے دل کی حسرتیں — سایے میں پائے خضر کو سہلا رہا ہوں میں

رستے کی اونچ نیچ سے واقف تو ہوں امیں
ٹھوکر قدم قدم پہ مگر کھا رہا ہوں میں

نازہی کیا نیاز مندوں کا — بندگی ہے شعار بندوں کا

جس طرح مے خمار کا ہے علاج — دردِ درماں ہے دردمندوں کا

ہر حسیں چیز کا ہوں گرویدہ — کیا ہی کہنا مری پسندوں کا

زندگی میں فراغ ناممکن | زندگی سلسلہ ہے دھندوں کا
دل کی خودداریوں کی خیر نہیں | دور دورہ ہے خود پسندوں کا
بلبلو! باغ میں تمھیں ہو ہدف | غنچہ و گل کے ریشخندوں کا

بوالہوس کی آہیں بلا جانے
عشق مسلک ہے دردمندوں کا

نمودِ رنگ و بو نے مار ڈالا | اِسی کی آرزو نے مار ڈالا
نہ دُنیا ہی کا رکھا اور نہ دیں کا | دلِ مدہوش تو نے مار ڈالا
تکلّم کا فسوں، اللہ اکبر! | کسی کی گفتگو نے مار ڈالا
نہ روداد حبابِ زندگی پوچھ | خرامِ آب جو نے مار ڈالا
خدا واعظ سے سمجھے حشر کے دن | ہمیں اس بے وضو نے مار ڈالا

زمانے کے آگے منہ کون آتا
خیالِ آبرو نے مار ڈالا

تامل ہے یہ تری اپنی کم نگاہی کا | کہ ہر چمکتی ہوئی چیز زر نظر آئے
وہ دل کہاں تپشِ دل گداز سے آگاہ | کہ جس کی آنکھ کو جگنو شرر نظر آئے

محبت کی کہانی درد سے خالی نہیں ہوتی | گُل اِس پہ ہوں نہ ہوں بیکار یہ ڈالی نہیں ہوتی
جنونِ عشق مشقِ چاک دامانی نہیں کرتا | ابھی جب تک تمنّاؤں کی پامالی نہیں ہوتی

حیات رزم ہے بزمِ رباب و چنگ نہیں | سرورِ آتشِ سیال کیفِ بنگ نہیں

فضائے دہر میں پرواز شور سے کرنا　　حیاتِ شہپرِ پرواز ہے پتنگ نہیں

تلاشِ عیشِ جہاں مقصدِ حیات نہیں　　سرود و رقص کی محفل یہ کائنات نہیں
مدارِ زیست آئین، جدوجہدِ پیہم ہے　　حیات روزِ و غاہی شبِ برات نہیں

پکڑ صراحی کو گردن سے قیل و قال نہ کر　　اگر یہ ٹوٹ بھی جائے، تو کچھ ملال نہ کر
محال ہے کہ ترا ظرف تشنہ کام رہے　　خودی کا ہاتھ بڑھا خود اُٹھا سوال نہ کر

مثلثِ معنوی

رہے بینا سفر میں اور حضر میں　　پڑے چہرے پہ، اگر جائے جگر میں
حقیقت کو سمجھ لے اِک نظر میں　　دکھائی دے جسے قطرہ گہر میں
عطا یا رب مجھے ایسی نظر ہو
جسے سختی نہ سہلائے وہ دل دے　　جو مشکل میں نہ گھبرائے وہ دل دے
جو روئے اور نہ چلّائے وہ دل دے　　دو عالم سے جو بھڑ جائے وہ دل دے
کسی کا خوف ہو جس کو نہ ڈر ہو

مثلثِ معنوی ۔ مثلث ہلکی قسم کی شراب انگور + آبِ انگور کو آنچ دے کر تھوڑا سا خشک کر لیا جاتا ہے ۔ اِس عمل سے آنچ دیا ہوا آبِ انگور کسی حد تک نشہ آور بن جاتا ہے، جسے اہلِ ایران مثلث یا مثلثِ شرعی کہتے ہیں۔

نقابِ جلوۂ مستور یعنی سراپا سوزِ شمعِ طور یعنی
جنابِ عشق کا مامور یعنی حریفِ قیصر و فغفور یعنی
مرا، یارب! جگر، ایسا جگر ہو

وہ بندہ کیوں نہ شمشیرِ خدا ہو نہ کیوں آپ اپنا وہ مشکلکشا ہو
وہ فطرت پر نہ کیوں فرمانروا ہو جسے جامِ مثلث یہ عطا ہو
نظر ہو جس میں دل ہو اور جگر ہو

بیخود دہلوی
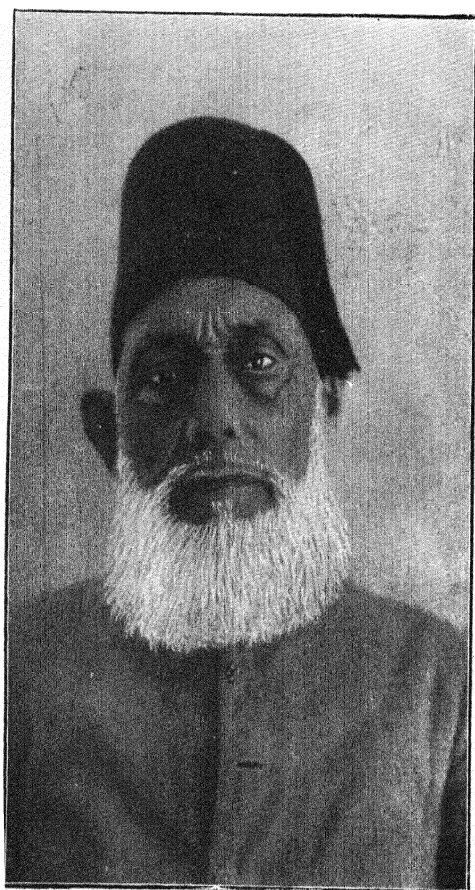
۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

بیخود دہلوی

بیخود دہلوی

سرگزشت

سیّد وحید الدین احمد نام، بیخود تخلص، والد کا نام سیّد شمس الدین احمد، دادا کا سیّد بدرالدین احمد کاشف، اور پردادا کا نواب سیّد امیر احمد خاں بہادر تھا۔ یہ عالمگیرِ ثانی کے وزیر تھے۔

سلسلۂ نسب سلطان العارفین حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رح سے بائیسویں پشت میں ملتا ہے۔

بیخود بھرت پور میں پیدا ہوئے، ۳۰۔ رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ تاریخِ ولادت ہے۔ دو ماہ بعد اِن کے والد مع اہل و عیال دلّی چلے آئے۔ چار سال کی عمر سے دلّی میں اُردو فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ خوش قسمتی سے ملک کے مشہور ادیب حضرت علامہ خواجہ الطاف حسین حالؔی جیسے اُستاد ملے۔ گھر میں ایک مایۂ ناز ادیبہ "مریم زمانی بیگم"، کے آغوشِ تربیت میں لال قلعے کی ٹکسالی اُردو بولنے اور سیکھنے کا فخر حاصل ہوا۔

شعر گوئی خاندانی مشغلہ تھا۔ اِس لیے بچپن ہی سے طبیعت کا

رجحان اِس طرف زیادہ تھا۔ ۱۳ سال کی عمر میں دنیائے شاعری میں قدم رکھا، جس کا پہلا نقش یہ ہے :۔

دِل سے نکل گیا کہ جگر سے نکل گیا
تیرِ نگاہِ یار کدھر سے نکل گیا

۱۶ سال کی عمر تک کوئی مستقل اُستاد اختیار نہیں کیا۔ گاہے گاہے علامہ حالی سے مشورۂ سخن کرلیتے تھے۔ ۱۳۰۹ھ میں فصیح الملک داغ دہلوی کے باقاعدہ شاگرد ہوئے، مگر تقریباً ۶ ماہ اصلاح سے بہرہ یاب ہوئے تھے کہ اُستادِ مشفق نے فرمایا "اب تم کو اصلاح کی ضرورت نہیں۔"

شاعری کے علاوہ شکار، شہسواری اور تیغ رانی میں بھی ملکہ پیدا کیا تھا۔ فنِ خطاطی میں یدِطولیٰ تھا، لیکن اب سترہ اٹھارہ سال سے ہاتھ میں رعشہ پیدا ہوجانے کے باعث لکھنے سے تقریباً معذور ہیں۔ پاؤں میں رانگن کا درد رہتا ہے، جس کے سبب سے ایک پاؤں پھیلاکر بیٹھتے ہیں۔

پیرانہ سالی کے باوجود طبیعت میں نوجوانوں جیسی شوخی ہے۔ بڑے بذلہ سنج، لطیفہ گو، اور رنگین کلام ہیں۔ شاندار چہرے سے وسیع الخیالی، اور مستقل مزاجی کا پتا چلتا ہے۔ بزرگ صورت، پاکیزہ سیرت، صاف گو، سادہ وضع، اور عہدِ قدیم کی مکمل یادگار اور زندہ تصویر ہیں۔ پان بالکل نہیں کھاتے، البتہ حُقّے کا بیحد شوق ہے۔ شغلِ شاعری و اصلاحِ ادب کے ساتھ اشتغالِ دینی بھی بدستور جاری ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے خاص طور پر پابند اور ورد و وظائف کے عادی ہیں۔ اکثر

باوضو رہتے ہیں۔ ایک بار حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ "میں جذباتی شاعر ہوں اور اسی قسم کے اشعار کہتا ہوں۔ لیکن اپنے خیال و جذبہ کے ماتحت ہر شاعر شاعری سے جُدا جُدا کام لے سکتا ہے۔"

آپ شعر میں ردیف و قافیہ کو لازمی سمجھتے ہیں اور شاعری کی طرزِ جدید کے مخالف ہیں۔

ہندی وغیرہ کے اُن الفاظ کا اُردو شاعری میں شمول جائز سمجھتے ہیں، جو محاورے میں آجائیں۔

نظم میں میر انیسؔ، اور حالیؔ کو اُستاد سمجھتے ہیں اور غزل میں داغؔ دہلوی کو۔

تصانیف میں دو ضخیم دیوان، ایک گفتارِ بیخود (مطبوعہ ۱۳۲۳ھ) اور دوسرا دُرِ شہوار (مطبوعہ ۱۳۳۹ھ) منظرِ عام پر آچکے ہیں اور اِسی قدر کلام غیر مطبوعہ موجود ہے۔

اِن کا خیال ہے کہ اُردو کی ترقی کے لیے ہر اُردو جاننے والے کا فرض ہے کہ خود اُردو بولے اور لکھے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دے، نیز مدارس میں بھی اُردو لازمی کی جائے اور دوسری زبانوں سے جدید علوم و فنون کے ترجمے کیے جائیں۔

حضرتِ بیخود نے کوئی سرکاری ملازمت نہیں کی، البتہ دلّی کے انگریز افسروں کو تقریباً ۳۲ سال تک اُردو فارسی کی تعلیم دی ہے۔

رام پور میں صاحبزادے سید شبیر علی خاں صاحب بہادر تغیر عرف ننھے صاحب مرحوم و مغفور سے خصوصی تعلقات تھے، اِس لیے

اکثر رام پور آنے اور رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔

انھیں دیگر اساتذہ کے یہ چند اشعار پسند ہیں :-

انشا
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری، راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں

مومن
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالی
اِک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں؟

"
حالی نشاطِ نغمہ ومے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں؟

داغ
میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا تھا کہ "حضرت اِدھر کہاں؟"

داغ
رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں:-
اُدھر جاتا ہے دیکھیں، یا اِدھر پروانہ آتا ہے"

"
دمِ فریاد نالے حلق میں چھریاں چبھوتے ہیں
زباں تک ٹکڑے ہو ہو کر مرے افسانہ آتا ہے

"
ہجر کی یہ رات کیسی رات ہے
ایک میں ہوں یا خدا کی ذات ہے

انتخابِ کلام

اُٹھّے تری محفل سے تو کس کام کے اُٹھّے
دِل تھام کے بیٹھے تھے جگر تھام کے اُٹھّے

دم بھر مرے پہلو میں اُنھیں چین کہاں ہے
بیٹھے کہ بہانے سے کسی کام کے اُٹھّے

افسوس سے اغیار نے کیا کیا نہ ملے ہاتھ
وہ بزم سے جب ہاتھ مرا تھام کے اُٹھّے

دُنیا میں کسی نے بھی یہ دیکھی نہ نزاکت
اُن سے نہ کبھی حرف مرے نام کے اُٹھّے

جو ظلم و ستم تم نے کیے سب وہ اُٹھائے
اِک رنج و الم ہم سے نہ الزام کے اُٹھّے

صدمے تو بہت قید میں جھیلے مرے دل نے
جھٹکے نہ مگر زلفِ سیہ فام کے اُٹھّے

ہے رشک کہ یہ بھی کہیں شیدا نہ ہوں اُسکے
تُربت سے بہت لوگ مرے نام کے اُٹھّے

افسانۂ حُسن اُس کا ہے ہر ایک زباں پر
پردے نہ کبھی جس کے درِ بام کے اُٹھّے

آغازِ محبت میں مرے دل نے اُٹھائے
پوچھے تو کوئی رنج بھی انجام کے اُٹھّے؟

دل نذر میں دے آئے ہم اُس شوخ کو بیخود
بازار میں جب دام نہ اس جام کے اُٹھّے

ارمان اگر نکلے، ارمان کا کیا کہنا
احسان کرو دل پر احسان کا کیا کہنا

معشوق سہی پریاں، مشہور سہی حوریں
انسان سے کیا نسبت، انسان کا کیا کہنا

اُس بات کی ضد کیسی، جو سُن نہ سکے کوئی
ارمان ہی چھوڑو اُن کی، ارمان کا کیا کہنا

پوشیدہ رہا دل میں اللہ رے ترا پردہ
ہر شے سے نظر آیا، اِس شان کا کیا کہنا

ہے جان کا غم زاہد اُس بُت کی محبت میں
ایمان سلامت ہے ایمان کا کیا کہنا

خط میں مجھے لکھا ہے "دشمن سے ملو جاکر"
قسمت کا نوشتہ ہے، فرمان کا کیا کہنا

کیا بات ہے اُس دل کی جس میں تو سما جائے　　　قربان ہو جو تجھ پر اُس جان کا کیا کہنا
چٹکی میں ہے تیر اتنک چٹکی سی نہیں چھوڑا　　　آنکھوں میں کھٹکتا ہے پیکان کا کیا کہنا

بیخودؔ کی خموشی سے گُم ہوش ہیں قاتل کے
قدموں ہی پہ دم توڑا اوسان کا کیا کہنا

سراپا درد ہوں بیدردیِ حسن سے مائل ہوں
مری فریاد سے ڈر ناکہ میں ٹوٹا ہوا دِل ہوں

تصور اپنا ہوں دل سے نکلنے کے لیے تیرے
تری محفل میں آکر بیٹھ جانے کے لیے دِل ہوں

مزے سے شرمِ عصیاں کے، اگر آگاہ ہو جائے
تمنّا ہو یہ زاہد کو، گنہگاروں میں داخل ہوں

خدا جانے جوانی کی طرح پھر میں کدھر جاؤں
تعاقب میں رواں، عمرِ رواں کے چند منزل ہوں

خیالِ گیسوے پُر خم سے وحشت کام لیتی ہے
مری دیوانگی دیکھو کہ پابندِ سلاسل ہوں

مجھے مطلب، کروں ناصح سے حجت، اُس کو بکنے دو
کوئی دیوانہ ہوں، نادان ہوں، یا میں بھی جاہل ہوں

بقولِ حضرتِ اُستاد، کس گنتی میں ہوں بیخودؔ
کسی فن میں نہ لائق ہوں، نہ فائق ہوں، نہ کامل ہوں

غمِ اُلفت سے دل لاکھوں پریشاں ہوتے جاتے ہیں
یہ گھر آباد ہو جانے سے ویراں ہوتے جاتے ہیں

یہ میری بیکسی، اور مجھ پہ احساں ہوتے جاتے ہیں
کہ وہ کچھ خود بخود دل میں پشیماں ہوتے جاتے ہیں

بجائے ناخنِ وحشت، مجھے درکار ہیں نشتر
کہ اب تارِ گریباں بھی رگِ جاں ہوتے جاتے ہیں

جوانی میں سمجھ آتی ہے، ہم قائل نہیں اس کے
کہ جتنی عمر بڑھتی ہے، وہ ناداں ہوتے جاتے ہیں

خموشی ہو تو ہمدم اور بڑھتی ہے کھٹک دل کی
کریں کیا ضبطِ غم، نالے بھی پیکاں ہوتے جاتے ہیں

نگاہِ لطف بھی تلوار کے ہمراہ پڑتی ہے
غضب یہ ہے، ستم کے ساتھ احساں ہوتے جاتے ہیں

وہ دل ہی جب نہیں پہلو میں پھر پاسِ وفا کیسا؟
ہمارے عقدۂ دشوار آساں ہوتے جاتے ہیں

نگاہیں جب لڑیں آپس میں، یہ بھی دیکھتے جاؤ
عیاں کس کی نظر سے رازِ پنہاں ہوتے جاتے ہیں؟

وہی ہم ہیں، وہی دل ہے، وہی اُن کی تمنّا ہے
نئے سر سے اُنھیں باتوں کے ارماں ہوتے جاتے ہیں

نہ دیکھے ہوں گے رندِ لاأبالی تم نے بیخود سے
کہ ایسے لوگ اب آنکھوں سے پنہاں ہوتے جاتے ہیں

غضب ہے اس تمنا سے وہ خواہش دل کی کرتے ہیں
زمانہ جانتا ہے اُن کے دشمن مجھ پہ مرتے ہیں

وہیں بیٹھے رہو بس دور ہی سے بات کرتے ہیں
ستم کیسا تمھارے لطف سے بھی ہم تو ڈرتے ہیں

تجھے بھی بیٹھے بیٹھے وہم کچھ ناصح گزرتے ہیں
لیے مرتا ہے ہم کو مُفت کیوں ہم کس پہ مرتے ہیں

کسی نے دل کو چھینا جان کو جھپٹا ستم ڈھایا
تری نیچی نگاہوں کے اشارے ظلم کرتے ہیں

چُرا کر دل وہ کہتے ہیں کہ کرتی ہے بلا اپنی
ہمیں کیا آپ کی چوری ہے؟ ہم کیا کوئی ڈرتے ہیں؟

یہ کوئی بھید ہے اِس میں بھی کوئی راز مخفی ہے
مرا دل دیکھ کر وہ اپنے دل پر ہاتھ دھرتے ہیں

لبِ معجز نما چشمِ سخن گو جھوٹے ہیں دونوں
اشارے سے وہ پھرتی ہے یہ وعدے سے مُکرتے ہیں

ہماری جان ہو کر جب جُدا رہتے ہو تم ہم سے
تو پھر کیا جھوٹ کہتے ہیں جو ہم کہتے ہیں مرتے ہیں؟

تڑپ اُٹھتا ہوں دل کے ساتھ میں بھی مضطرب ہو کر
تسلّی کے لیے اِس ناز سے وہ ہاتھ دھرتے ہیں

بجھالیں شمع کے دل کی لگی پروانے، جب جانیں
یہ اپنی آگ میں جلتے ہیں، تو کیا گُل کترتے ہیں

نگاہیں جستجوئے غیر سے خالی نہیں رہتیں
نظر پر جب کوئی چڑھتا ہے، ہم دل سے اُترتے ہیں

جھجک کیسی، یہ خنجر پھیرنے سے ہچکچانا کیا؟
نہ تڑپیں گے، قسم لے لیجیے، کیوں آپ ڈرتے ہیں؟

فدا ہیں ابروئے پُرخم پہ، سیدھی بات تو یہ ہے
بھریں گے زخم کیا اُن کے جو دم خنجر کا بھرتے ہیں

نزاکت سے رُکا خنجر، گِلہ ہے سخت جانی کا
وہ اپنا بوجھ بھی گویا مری گردن پہ دھرتے ہیں

مری شامت کہ میں نے اُن کو تصویریں دکھادی تھیں
وہ حسنِ لیلیٰ و شیریں پہ ابتک نام دھرتے ہیں

نہ اپنے قول کے پورے، نہ اپنی بات کے پکے
وہ رہ رہ کر پلٹتے ہیں، وہ کہہ کہہ کر مکرتے ہیں

تمھارے منھ سے میں جس دم کسی کا نام سنتا ہوں
ہزاروں وہم آتے ہیں، ہزاروں شک گزرتے ہیں

خدا سے ڈر، جو ہر اک بات پر ارشاد ہوتا ہے
مجھے کیوں کر یقیں آئے، خدا سے آپ ڈرتے ہیں؟

سنبھل جائیں گے بیخود دم آگیا ہے غش، نہ گھبراؤ
بھلی تشویش کی تم نے، بھلا ایسے بھی مرتے ہیں

ہاتھ میں طاقت اگر اے نازنیں اتنی نہیں

پھیر دے دل پر چھُری ہاں چیں جبیں اتنی نہیں

سچ تو یہ ہے، ماہ کی روشن جبیں اتنی نہیں

روشنی جو تیرے رُخ میں ہے کہیں اتنی نہیں

یار بدخو، آسماں دشمن، زمانہ برخلاف

یہ مصیبت سہہ سکے جانِ حزیں اتنی نہیں

جس قدر بیباکیوں کی ہیں ادائیں چلبلی

شوخیاں تجھ میں، نگاہِ شرمگیں، اتنی نہیں

ہم نے دیکھا ہے زمانہ، ہم نے برتے ہیں حسیں

بندہ پرور، ظلم کی کثرت کہیں اتنی نہیں

آپ جاتے ہیں، تو اِس کو ساتھ لیتے جائیے

پھر پلٹ آئے، نگاہِ واپسیں اتنی نہیں

بدنصیبوں کو ترے مر کر ہوئی راحت نصیب

آسماں جتنا مخالف تھا زمیں اتنی نہیں

بُتکدے میں دل ٹٹولو دل جنابِ شیخ کا

بُت چرا کر جس میں رکھ لیں آستیں اتنی نہیں

وہ دھواں اٹھا فلک پر سر اٹھا کر دیکھیے

پھر نہ کہیے گا کہ آہِ آتشیں اتنی نہیں

پہلے دیکھی غور سے تصویرِ یوسف پھر کہا
جتنی دیکھت میں ہے اچھی دلنشیں اتنی نہیں

عیب اپنے کچھ ہمیں کو خوب آتے ہیں نظر
خوف ہو جس کا نگاہِ نکتہ چیں اتنی نہیں

جس قدر مضموں بھرے ہیں دل میں بیخود کیا کہیں
آسماں تو ہم بنا دیں، یہ زمیں اتنی نہیں

بُلایا موت کو برسوں میں التجا کر کے
خدا کے پاس چلا ہوں خدا خدا کر کے

حجاب آ ہی گیا ہم کو التجا کر کے
درِ قبول سے ہٹ آئے ہم دعا کر کے

ہمیں تو رنج نہ ہو جان بھی فدا کر کے
ذرا سا مُنہ نکل آیا ترا جفا کر کے

خیالِ یار میں مرنا وصال سمجھا ہوں
زبان بند ہوئی وصل کی دعا کر کے

ادا ہے شرط بناوٹ بھی لطف دیتی ہے
وہ خود بھی روٹھ گئے ہیں مجھے خفا کر کے

ملی ہے دولتِ دیدار دل کے صدقے میں
رہیں گے آج تو ہم جان بھی فدا کر کے

عطا ہو یا نہ ہو کچھ ہم کو اس سے کیا مطلب
غرور ہم کو مٹانا ہے التجا کر کے

زباں پہ رہتی ہے ہر وقت توبہ استغفار
پھرے ہیں کعبہ سے ای شیخ آپ کیا کر کے

رہوں گا شکر کے سجدے میں حشر تک مصروف
کہ وہ نواز گئے سر مرا جُدا کر کے

کرم کیا کبھی مجھ پر تو جل گئے دشمن
بُرا بنا کوئی سب میں مرا بھلا کر کے

غرورِ کبر نے آخر گناہ گار کیا
ڈبو دیا مجھے مشہور پارسا کر کے

عذاب کہتے ہیں جس کو ہوس ہے دُنیا کی
ملا ہے چین یہاں ترکِ مدعا کر کے

کہیں نہ عشق کے دفتر سے نام کٹ جائے
زبان کاٹ رہا ہوں ترا گلا کر کے

۱۱۰

وظیفہ خوانیِ بیخودؔ کا راز سمجھے کبھی
بتوں سے ربط بڑھایا خدا کرکے

ثاقب لکھنوی

۲۳ مارچ ۱۹۴۱ء

ثاقب لکھنوی

غزل
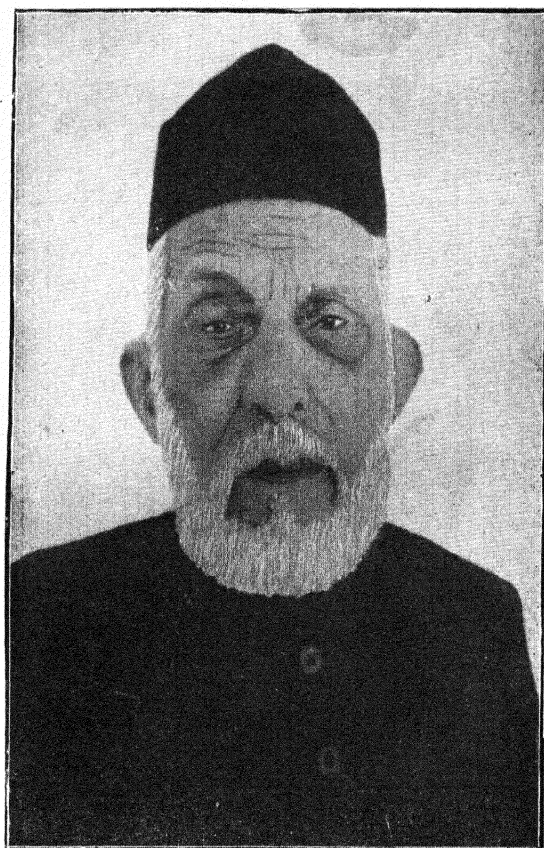
وہی قدرت باری کو پہچانتا ہے
جو اپنی حقیقت کو خود جانتا ہے

اٹھاتا ہے دل دلنشیں دوستوں پر
مگر میرا کہنا نہیں مانتا ہے

طریق نیاز و رہ طرز تغافل
یہ میں جانتا ہوں وہ تو جانتا ہے

حقیقت وہاں ہے بعنوان دیگر
یہاں اور کچھ دل میں تو ٹھانتا ہے

ستمگر وہی جیب و دامن ہے ورنہ
گلہ کیجئے تو برا مانتا ہے

بری ہو نہیں لوث گنہ سے مگر دل
مجھے اپنے کردار میں سانتا ہے

ادھر سنگ کو نہیں ادھر میرا قاتل
بے قتل دامن کو گردانتا ہے

صفائی کہاں خاکدان جہاں میں
وہ سب کرکرا ہے جو تو چھانتا ہے

غنیمت ہے ثاقب کا دم لکھنؤ میں
وہ جو کچھ برا یا بھلا جانتا ہے

الراقم
خاکسار میرزا ثاقب قزلباش
۲۴ ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

ثاقب لکھنوی

سرگذشت

میر ذاکر حسین نام، ثاقبؔ تخلص، اور تاریخِ ولادت ۱۹ رمضان المبارک ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) ہے۔

سلسلۂ نسب علی قلی خاں شاملو سے ملتا ہے، جو شاہ طہماسپ صفوی کے معتمد علیہ اور طبرستان کے باشندے تھے۔ اِن کے مورثِ اعلیٰ نے اکبر آباد آکر سکونت اختیار کر لی۔ مگر میرزا چھ ماہ کے ہوں گے کہ اِن کے والد کو اکبر آباد چھوڑ کر لکھنؤ آنا پڑا، جہاں تا حال اِن کی سکونت ہے۔

ابتدائی تعلیم پُرانے طرز پر لکھنؤ ہی میں ہوئی، انگریزی پڑھنے کے لیے چار سال آگرے میں قیام رہا۔ آگرے ہی میں میر مومن تقی کی صحبت سے ذوقِ شعر گوئی پیدا ہوا اور یہیں مشقِ سخن کی بُنیاد پڑی۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔

ثاقبؔ کتابی چہرے، چھریرے جسم اور درمیانی قد کے نیک صورت، خوش اخلاق اور سن رسیدہ بزرگ ہیں۔ بذلہ سنجی و ظرافت گفتگو میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ دوست نوازی، مذہب کی پابندی

اور خلوص و محبت سے ملنا اِن کی نمایاں صفات ہیں۔ عرصے سے ریاست محمود آباد سے وثیقہ پاتے ہیں، اور شبانہ روز یادِ خدا اور فکرِ شعر و سخن میں مشغول رہتے ہیں۔

اِن کے نزدیک شاعری کا روحانی پہلو اہم ہے اور واردات قلبی کو نظم کرنا اولیٰ ہے۔

اُردو زبان میں ہندی، بھاشا، وغیرہ کے جو الفاظ شامل ہو چکے ہیں اور جن کو اہلِ زبان لکھتے اور بولتے ہیں، اُن کو ثاقب صاحب کی رائے میں بدستور باقی رکھا اور استعمال کیا جائے۔ لیکن جدید الفاظ تاوقتیکہ اساتذہ کا گروہ اُن الفاظ کو داخلِ اُردو زبان نہ کرلے استعمال نہ کیے جائیں، جیسے "ستی" کا لفظ ؎

ذرا دیکھ پروانے کروٹ بدل کر
ستی ہو گئے شمع محفل میں جل کر

اُردو ادب کی خدمت کے متعلق اِن کا خیال یہ ہے کہ جو طریقہ "بزم ادب رام پور" نے اختیار کیا ہے، وہ پسندیدہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انشا پرداز اور شعراے باکمال کو خاص خدمات سپرد کی جائیں، تاکہ وہ اپنے اپنے مقام پر بیٹھ کر اطمینان سے کام انجام دے سکیں۔

کلام میں ردیف و قافیہ کی پابندی ضروری جانتے ہیں۔ اِن کے نزدیک بے قافیہ نظم مبتذل ہوتی ہے اور اُس سے شاعر کا قصورِ طبع ظاہر ہوتا ہے۔

دیگر اساتذہ کے حسبِ ذیل اشعار آپ کو پسند ہیں:۔

غالب — آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

〃 — وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر، اے سنگ دل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

〃 — میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

میر — آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

میر و غالب کا کلام بہت زیادہ یاد ہے:
نظم میں سودا، ذوق، اور مومن خاں کو، اور غزل میں میرزا غالب، خواجہ میر درد، میر تقی، اور میر سوز کو اُستاد مانتے ہیں۔

انتخابِ کلام

پردہ رہا کہ جلوۂ وحدت نما ہوا — غش نے خبر نہ دی مجھے کب سامنا ہوا
گلشن سے اُٹھ کے میرا مکاں دل میں آگیا — اِک داغ بن گیا ہے نشیمن جلا ہوا
کیا تیرگی لیے ہوئے آئی شعاعِ نور — دیکھا شبِ فراق ازل کا لکھا ہوا
جب تک تھا میں، عروج پہ تھا حسنِ جاں بستاں — پھر کچھ خبر نہیں کہ مرے بعد کیا ہوا

کہنے کو مشتِ پر کی اسیری تو تھی مگر
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

دیارِ دل ہی کہیں دوست کا پتا نہ ملا — وہ بدنصیب ہوں کعبے میں بھی خدا نہ ملا
شریکِ قید تھے جذباتِ دل مگر بیکار — قفس تھا ایسا کہ نالوں کو راستا نہ ملا
عدو کے مارے ہوؤں سے زمانہ مملو ہے — قتیلِ دوست جہاں میں مرے سوا نہ ملا
ذرا سی خاک سے پیدا ہوا تھا دل لیکن — جہاں سمائے جہاں، ایسا دوسرا نہ ملا

یہ کس نے غم کدۂ دُنیا کا نام رکھا ہے
ہمیں تو کوئی یہاں دردآشنا نہ ملا

عشق مظلوم بے خطا نہ ہوا — حُسن اچھوں میں بھی بُرا نہ ہوا
سونے والوں کو کیا خبر اے ہجر — کیا ہوا ایک شب میں کیا نہ ہوا
ہنس کے بھی، رو کے بھی کہا لیکن — مطلبِ دل کبھی ادا نہ ہوا
بستر اُٹھا نہ کوئے قاتل سے — شکر ہے پاس بوریا نہ ہوا
آشنا تھا مذاقِ عشق سے دل — تلخکامی سے بے مزا نہ ہوا

نہ ذکرِ انبساط کر کہ دورِ عیش ہو چکا — خوشی کی فکر کس لیے وہ دل کہاں جو کھو چکا

یہ خندۂ طرب نما مبارک اہلِ دہر کو — بہت زمانہ ہو گیا کہ میں ہنسی کو رو چکا

نہ ڈھونڈ اہلِ دل کو اب کہ جوشِ قلزمِ فنا — متاعِ درد جن میں تھی وہ کشتیاں ڈبو چکا

رہے وہ دل میں مدتوں مگر سنبھل سکا نہ میں — مزاجِ حسن و عشق کو بہت دنوں سمو چکا

یہ آشیانۂ ستم چمن میں ہو تو خوب ہو
یہ جی میں ہے کہ لے اُڑوں قفس تو میرا ہو چکا

آنکھ پڑتے ہی نہ تھا نامِ شکیبائی کا — درِ میخانہ تھا نقشہ تری انگڑائی کا

آئینہ جس میں سدا ڈوب کے اُبھرا کیا حسن — ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا

آنے دے نیند تو سب ٹھیک مگر اے توبہ — نالہ عاشق کا اور اُس پر شبِ تنہائی کا

پاکدامانئ یوسف تھی زلیخا کو سزا — راستہ چاک سے پیدا ہوا رسوائی کا

شوقِ پابوسئ محبوب تھا ورنہ ثاقبؔ
سنگِ در پر کوئی موقع تھا جبیں سائی کا

بنتے ہی گھر ابتدا میں رو کشِ انجام تھا — تنکے چن کر جب نظر کی آشیاں اک دام تھا

بس یہی فقرہ کہ ”شامِ ہجر نے مارا مجھے“ — کوئی کہہ آتا تو کتنا مختصر پیغام تھا

میرے نالے تھے شبِ فرقت میں کتنے بر محل — اُن کے کانوں میں مگر اک شورِ بے ہنگام تھا

سر چڑھایا میں نے چن چن کر خس و خاشاک کو — باغ کے تنکے تھے وہ جن کا نشیمن نام تھا

معرفت غم کی نہیں اور پوچھتے ہیں حالِ ہجر
بس یہی کہہ دوں کہ ہاں آرام ہی آرام تھا

جب میں کہتا ہوں کوئی وصل کا ساماں نہ ہوا — کان میں آتی ہے آواز کہ ”جی ہاں نہ ہوا“

بوئے گُل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی
میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

حال وہ تھا کہ جسے دیکھ کے دشمن نہ ہنسا
زخم وہ تھا کہ جو ممنونِ نمکداں نہ ہوا

غنچہ و گُل تو ہیں ہمشکل مگر فرق کو دیکھ
ایک گریاں نہ ہوا دوسرا خنداں نہ ہوا

گوہرِ عشق کی نایابی و عزت کو سمجھ
بھر دیا صحنِ جہاں کو مگر ارزاں نہ ہوا

دل کے چھوٹے تھم نہیں سکتے بسیطِ خاک پر
جو گرا آنسو وہ تارا ہو گیا افلاک پر

صبر کی سالم قبائیں تو ہزاروں ہیں مگر
ٹھیک ہوتی ہی نہیں کوئی دلِ صد چاک پر

دم نہیں لیتا دھواں دل کا نظر آتے تو کیا
سیکڑوں پردے پڑے ہیں دیدۂ ادراک پر

آتشیں ہوتا نہ آبِ خاک زاد اتنا مگر
آفتاب ایسا ہی چمکا تھا عنب کی تاک پر

بارِ خوں کیوں کر اُٹھا لیتے ہیں وہ نازک مزاج
زرد ہو جائیں جو رنگ آئے کوئی پوشاک پر

خوش ہو سکا نہ حالِ دلِ زار دیکھ کر
جلتا ہے غیر میری شبِ تار دیکھ کر

وقفِ زبانِ اہلِ حسد ہے لہو مرا
خوش ہو رہا ہوں وادیٔ پرخار دیکھ کر

پتھر نہیں کہ طور کے وار آزمائے جائیں
اے برقِ حُسن حالِ دلِ زار دیکھ کر

طے کر کے آج خانہ بدوشی کی منزلیں
بیٹھا ہوں اُس کا سایۂ دیوار دیکھ کر

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں
ابرِ سیاہ جانبِ گلزار دیکھ کر

دل سے میں کہہ رہا ہوں تجھ پر ہوا فدا میں
دل مجھ سے کہہ رہا ہے او بے خبر چلا میں

تڑپا دیا ہو دل کو شاباش ہمصفیرو!
یونہی پھر اک صدا دو ٹوٹا قفس چلا میں"

وہ نزع کی خموشی جامِ جہاں نما تھی — اک عمر کی کہانی دم بھر میں کہہ گیا میں

رکھتا ہے جذب کتنا کاشانۂ محبت — دیکھا نہ مُڑ کے دل نے دیتا رہا صدا میں

پھر اور کس طرح سے اُجڑے مکاں کو سجتا
قصرِ لحد میں آ کر تصویر ہو گیا میں

مٹ کے بھی آئینۂ رخسارِ خوباں ہو گئیں — خونِ اہلِ عشق کی بوندیں گلستاں ہو گئیں

زندگی میں کیا مجھے ملتی بلاؤں سے نجات — جو دعائیں کیں وہ سب تیری نگہباں ہو گئیں

اس ہوا نے دہر میں جمعیتِ خاطر کہاں — دل کو جانے دو یہ زلفیں کیوں پریشاں ہو گئیں

لوٹ لی گردوں نے آخر دل کی ساری کائنات — کچھ تمنائیں تھیں وہ بھی وقفِ نسیاں ہو گئیں

کم نہ سمجھو دہر میں سرمایۂ اربابِ غم
چار بوندیں آنسوؤں کی بڑھ کے طوفاں ہو گئیں

لاغری سے اک ورق ہوں دفترِ تاثیر میں — جان پڑ جائے جو کام آئے تری تصویر میں

پیشِ عاقل بولتا ہے عالمِ نقش و نگار — کہہ گئی سب کچھ خموشی پردۂ تصویر میں

خون آنکھوں سے نکلتا ہے تو نکلے صبر کر — ہاں تمنا بھی نکلتی ہے مگر تاخیر میں

نامہ لکھتے وقت کیا جانے قلم کیونکر چلا — اضطرابِ دل نظر آنے لگا تحریر میں

آہیں کرتا جا کہ زورِ ناتوانی ہے بہت
جھک چلا ہے چرخ گر جائے گا دو اک تیر میں

اک کیفِ بیخودی میں کٹی شبِ وصال کی — اچھا ہوا خبر نہ ہوئی اپنے حال کی

ہر قطرۂ خونِ دل کا ہے قاتل سے زور دار — یا رب دراز عمر ہو روزِ سوال کی

اتنا بدل دیا تھا مرا رنگ ہجر نے — منہ دیکھتی رہیں مری راتیں وصال کی

کھُلتی نہیں حیات میں بے منتِ اجل	بے لاگ بند شیں ترے زلفوں کے جال میں

پہنچا دیا کلام کو ثاقب نے عرش پر
تقلید کر کے میر سے صاحب کمال کی

ایک ایک گھڑی اُس کی قیامت کی گھڑی ہے
جو ہجر میں تڑپائے وہی رات بڑی ہے

یہ ضعف کا عالم ہے کہ تقدیر کا لکھا
بستر پہ ہوں میں یا کوئی تصویر پڑی ہے

بیتابئ دل کا ہے وہ دلچسپ تماشا
جب دیکھو شبِ ہجر مرے در پہ کھڑی ہے

اب تک مجھے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا
کیا جانیے کس آنکھ سے یہ آنکھ لڑی ہے

آدھی سے زیادہ شبِ غم کاٹ چکا ہوں
اب بھی اگر آجاؤ تو یہ رات بڑی ہے

اپنے ہی دل کی آگ میں آخر پگھل گئی
شمعِ حیات موت کے سانچے میں ڈھل گئی

تاثیرِ ہجر کون بتائے کہ میں تو میں
ہوتے ہی شام دہر کی صورت بدل گئی

سحرِ نگاہ میں نہ کہوں پھر تو کیا کہوں
چٹکی نہ تھی جو میرے کلیجے کو مل گئی

ہو کر نڈھال دل کی بحالی محال ہے

بجلی تو ہے نہیں کہ گری اور سنبھل گئی

ہے کچھ امیدِ زیست قفس میں مجھے مگر

اپنی ہی داستاں سے طبیعت بہل گئی

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے　　جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

وفا بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا وعدہ　　گھڑی دو گھڑی تو کبھی شاد رہتے

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی　　ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا　　ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

مری ناؤ اِس غم کے دریا میں ثاقب

کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

جگر مرادآبادی
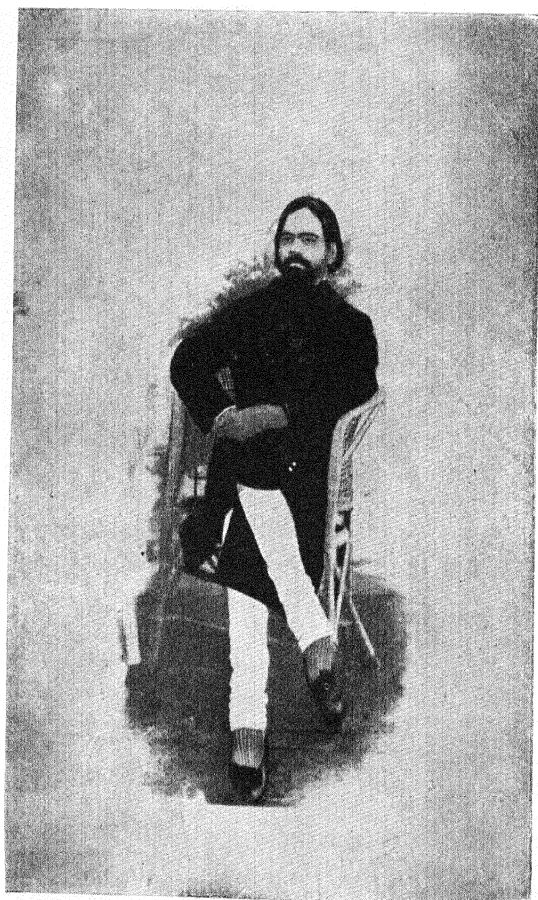
۲۴ دسمبر ۱۹۴۰ء

جگر مرادآبادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جو سرور میں بھی خلش نہیں، جو اذیتوں میں مزا نہیں
ترے حسن کا بھی قصور ہے، مرے عشق ہی کی خطا نہیں

مرے جذبِ عشق پہ تہمتیں، مجھے بے بسی کا گلا نہیں
ترے جبرِ حسن کی خیر ہو، مرے اختیار میں کیا نہیں

جسے میں بھی خود نہ بتا سکوں، مرا راز دل ہے وہ رازِ دل
جسے غیر درست سمجھ سکے، مرے ساز میں وہ صدا نہیں

مرا ذوق بھی، مرا شوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے
ترا ہجر بھی، ترا وصل بھی مرے دردِ دل کی دوا نہیں

یہ مرا جنوں ہی ہے خوب تر، کہ گرا وہ اضطراب بے خبر
اُسے ساز گار ہو زہد کیا جسے معصیت بھی روا نہیں

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی، مجھے پھر بھی غیر عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی وہ برا بھی ہو تو برا نہیں

مرے درد میں وہ خلش کہاں، مرے سوز میں وہ تپش کہاں
کسی اور ہی کی پکار ہے، مری زندگی کی صدا نہیں

وہی ربطِ عشق و وصال ہے، ترا اور کچھ جو خیال ہے
یہ سمجھ "کہ مجھ میں ہے کچھ کمی" یہ نہ کہو کہ جنوں وفا نہیں

مرے شعر میں ہیں نزاکتیں، مری نظم میں ہیں لطافتیں
مری فکر میں کہیں اے جگر "ادبِ کثیف" کی جا نہیں

جگر مراد آبادی

[illegible]

جگر مُرادآبادی

سرگزشت

علی سکندر نام، اور جگرؔ تخلص ہے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں اپنے وطن مُراد آباد میں پیدا ہوئے۔

اِن کے مورثِ اعلیٰ، مولوی محمد سمیع، شاہ جہاں بادشاہِ دہلی کے اُستاد تھے۔ کسی بات پر بگڑ کر چل دیے؛ اِس بنا پر خاندان کا ایک حصّہ اعظم پور باسٹھ میں رہ گیا، اور کچھ لوگ مُراد آباد آگئے۔ اِن کے دادا حافظ محمد نور، المتخلص بہ نورؔ خوش گو شاعر تھے۔ اِن کے والد مولوی علی نظر، نظرؔ تخلص بھی اپنے وقت کے منتخب شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ اُنھوں نے ایک دیوان "باغِ نظر" کے نام سے چھوڑا ہے۔

جگرؔ کی انگریزی تعلیم صرف انٹرنس تک ہے؛ لیکن فارسی کی استعداد بہت اچھی ہے۔

جِس زمانے میں داغؔ دہلوی، رام پور سے حیدر آباد پہنچے، جگرؔ بھی وہاں مقیم تھے، اِس لیے اپنا کلام داغؔ کو دکھانے لگے۔ حیدر آباد سے واپسی پر منشی امیر اللہ تسلیم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔

آخر میں رسا رام پوری سے اصلاح لی۔

جگر نے اپنے متعلق لکھا ہے :۔

"بچپن ہی سے حسن سے مجھے ایک خاص ربط و نسبت رہی۔ رفتہ رفتہ یہ نشہ تیز تر ہوتا گیا۔ اس کی تکمیل آگرے کے قیام میں ہوئی۔ ناز بعد حالات اس درجہ اندوھناک ہوتے چلے گئے کہ غالباً حضرت اصغر کے توسط سے مجھے آستانۂ بنگلور سے شرفِ غلامی حاصل نہ ہو جاتا، تو یقیناً یا تو خودکشی کر چکا ہوتا، ورنہ بقول خود میرے ایک دوست کے زینتِ صحرا ہوتا۔ میری تربیت حضرتِ اصغر گونڈوی رحمۃ اللہ علیہ کے نفوس کی رہینِ منت ہے اور صحیح معنوں میں موصوف کی ذاتِ گرامی میری اصلاحِ شعر کی بھی ذمہ دار ہے۔"

جگر کا درمیانی قد اور سانولا رنگ ہے، متوسط الاعضا، فراخ پیشانی اور کشادہ چشم ہیں۔ سر کے بال بڑے رکھتے ہیں۔ چہرے سے شاعرانہ وحشت ٹپکتی ہے۔

ریاکاری اور بناوٹ سے نفرت ہے۔ جس سے ملتے ہیں، فراخ دلی اور گرم جوشی سے ملتے ہیں اور جس سے نفرت ہوتی ہے، اس کا منھ دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ خلوص و خودداری ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

کلام جس ترنم آمیز انداز سے پڑھتے ہیں، اُس کے خود ہی موجد بھی ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ عام فہم طریقۂ ادا اور ترکیبِ بندش سے اعلیٰ تخیل و معنی آفرینی، علم و ادب اور زبان کی خدمت ہے اور ثقیل

الفاظ و غیر مانوس تراکیب استعمال کرنا ادب کو غارت کرنا ہے۔
ہندی کے مانوس الفاظ بھی کم استعمال کرتے ہیں۔
اِن کو دیگر اساتذہ کے یہ چند اشعار پسند ہیں:۔

اقبال
نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

حسرت
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رُسوا کرنا
دیکھنا بھی تو انھیں دُور سے دیکھا کرنا

عصرِ حاضر میں مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں کے قائل اور علامۂ اقبال اور حضرت اصغر گونڈوی کے شاعرانہ کمال کے گرویدہ ہیں۔

ردیف و قافیہ کی پابندیاں اِن کے کلام میں مسلسل پائی جاتی ہیں اور اِس التزام کو شعر کہنے کے لیے واجبی تصور کرتے ہیں۔

کلام کا بیشتر حصّہ غزلیات پر مشتمل ہے، نظم بہت کم کہتے ہیں۔
عین مناظر کے مشاہدے سے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، وہی بیشتر غزل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

مشاعروں کے دعوت ناموں پر آئے دن سفر میں رہتے ہیں۔

انتخابِ کلام

مدت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم — خاموش اداؤں میں وہ جذبات کا عالم

نغموں میں سمویا ہوا وہ رات کا عالم — وہ عطر میں ڈوبے ہوئے لمحات کا عالم

اللہ رے وہ شدّتِ جذبات کا عالم — کچھ کہہ کے وہ بھولی ہوئی ہر بات کا عالم

چھایا ہوا وہ نشۂ صہبائے محبت — جس طرح کسی رندِ خرابات کا عالم

وہ سادگیٔ حُسن وہ محجوب نگاہی — وہ محشرِ صد شکر و شکایات کا عالم

نظروں سے وہ معصوم محبت کی تراوش — چہرے پہ وہ مشکوک خیالات کا عالم

عارض سے ڈھلکتے ہوئے شبنم کے وہ قطرے — آنکھوں سے جھلکتا ہوا برسات کا عالم

وہ نظروں ہی نظروں میں سوالات کی دنیا — وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جوابات کا عالم

ایک ایک نظر شعر و شباب و مے و نغمہ — ایک ایک ادا حُسن محاکات کا عالم

بے شرطِ تکلف وہ پذیرائیِ اُلفت — بے قیدِ تصنع وہ مدارات کا عالم

نازک سے ترنم میں اشارات کے دفتر — ہلکے سے تبسم میں کنایات کا عالم

وہ عشق کی بربادیٔ زندہ کا مرقع — وہ حُسن کی پایندہ کرامات کا عالم

تھک جانے کے انداز میں وہ دعوتِ جرأت — کھو جانے کی صورت میں وہ جذبات کا عالم

وہ عارضِ پُر نور وہ کیفِ نگہِ شوق
جیسے کہ دمِ صبح مناجات کا عالم

دل میں کسی کے راہ کیے جا رہا ہوں میں — کتنا حسیں گناہ کیے جا رہا ہوں میں

فردِ عمل سیاہ کیے جا رہا ہوں میں — رحمت کو بے پناہ کیے جا رہا ہوں میں

ایسی بھی اک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں
ذرّوں کو مہر و ماہ کیے جا رہا ہوں میں

دنیائے دل تباہ کیے جا رہا ہوں میں
صرفِ نگاہ و آہ کیے جا رہا ہوں میں

مجھ سے لگے ہیں عشق کی عظمت کو چار چاند
خود حُسن کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں

تنقیدِ حُسن مصلحتِ خاصِ عشق ہے
یہ جُرم گاہ گاہ کیے جا رہا ہوں میں

گلشن پرست ہوں مجھے گُل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

مجھ سے جگرؔ ہوا ہے ادا جستجو کا حق
ہر ذرّے کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں

اُس رُخ پہ اژدحامِ نظر دیکھتا ہوں میں
کانٹوں کی گود میں گلِ تر دیکھتا ہوں میں

معراجِ شوق و جذبِ اثر دیکھتا ہوں میں
دنیا اِدھر کی آج اُدھر دیکھتا ہوں میں

تاثیرِ التفاتِ نظر دیکھتا ہوں میں
کونین اپنے زیر و زبر دیکھتا ہوں میں

تنہا نہیں ہے عشق ہی بربادِ جستجو
خود حُسن کو بھی خاک بسر دیکھتا ہوں میں

رُعبِ جمال و ربطِ محبت تو دیکھنا
اُٹھتی نہیں ہے آنکھ مگر دیکھتا ہوں میں

وہ جو روٹھیں یوں منانا چاہیے
زندگی سے روٹھ جانا چاہیے

عشق کا ہر زخم کھانا چاہیے
زخم کھا کر مسکرانا چاہیے

لذتیں ہیں دشمنِ اوجِ کمال
کلفتوں سے جی لگانا چاہیے

زندگی ہے نام جہد و جنگ کا
موت کیا ہے، بھول جانا چاہیے

اُن سے ملنے کو تو کیا کہیے جگرؔ
خود سے ملنے کو زمانا چاہیے

اُن کی جفا پہ ترکِ وفا کر رہا ہوں میں
فطرت کو زندگی سے جدا کر رہا ہوں میں

ہر لذتِ سزا پہ خطا کر رہا ہوں میں
اب جو بھی کر رہا ہوں بجا کر رہا ہوں میں

کہنا نہ پھر کہ ہائے مجھے ہو گیا ہے کیا
لیجے، بلند دستِ دعا کر رہا ہوں میں

جب آ گئی ہے ضد مجھے سرکارِ حسن سے
ہر نقشِ آرزو کو مٹا کر رہا ہوں میں

میری ادائے شکرِ حضوری تو دیکھنا
صد شکوۂ فراق نما کر رہا ہوں میں

محبت میں یہ کیا مقام آ رہے ہیں
کہ منزل پہ ہیں اور چلے جا رہے ہیں

یہ کہہ کہہ کے ہم دل کو بہلا رہے ہیں
وہ اب چل چکے ہیں وہ اب آ رہے ہیں

وہ بے طرح نادم ہوے جا رہے ہیں
خدا جانے کیا کیا خیال آ رہے ہیں

ہمہ شعر و نغمہ ہمہ حسن و خوشبو
وہ کچھ گنگناتے چلے آ رہے ہیں

ہمارے ہی دل سے مزے آ کے پوچھو
وہ دھوکے جو دانستہ ہم کھا رہے ہیں

جفا کرنے والوں کو کیا ہو گیا ہے
وفا کر کے بھی ہم تو شرما رہے ہیں

مزاجِ گرامی کی ہو خیر، یارب
کئی دن سے اکثر وہ یاد آ رہے ہیں

نہیں جاتی کہاں تک فکرِ انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

طبیعت آ کے پھر تا حدِّ امکانی نہیں جاتی
نہیں جاتی نہیں جاتی، یہ دیوانی نہیں جاتی

کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بُجھا جاتا ہے دل، چہرے کی تابانی نہیں جاتی

نگاہوں کو خزاں نا آشنا ہونا تو آجائے
چمن جب تک چمن ہے، جلوہ سامانی نہیں جاتی

مزاجِ اہلِ دل بے کیف و مستی رہ نہیں سکتا
کہ جیسے نکہتِ گُل سے پریشانی نہیں جاتی

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے، مانی نہیں جاتی

نگاہِ شوق کی گُستاخیاں، توبہ ارے توبہ!
تلافی لاکھ کرتا ہوں، پشیمانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

چلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر، مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں، طغیانی نہیں جاتی

جگرؔ وہ بھی زسرتاپا محبت ہی محبت ہیں
مگر اُن کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

دکھا دے اے دلِ آگاہ عالی ہمتی اپنی
دو عالم بنکے پھیلا دے دو عالم میں خودی اپنی

جمال اُن کا مزاج اپنا، غم اُن کا زندگی اپنی
حیاتِ حُسن ہے گویا حیاتِ عاشقی اپنی

یہاں تک اب جگر پہنچی ہے معراجِ خودی اپنی
کہ حُسن اک مشغلہ اپنا ہی، عشق اک دل لگی اپنی

محبت رہ گئی بن کر مکمل زندگی اپنی
مُبارک بیخودی اپنی سلامت بیخودی اپنی

زمانہ تھا کبھی اپنا، یہ دُنیا تھی کبھی اپنی
مگر اب تو نہ شام اپنی، نہ صبحِ سرخوشی اپنی

مکمل تو کوئی کر لے حیاتِ عاشقی اپنی
خدائی چیز ہی کیا ہے، خدا اپنا خودی اپنی

مری بربادیوں میں کیوں ہے یہ احساس بھی شامل
مرے سر ڈالدیجے خیر سے شرمندگی اپنی

اسے سمجھے نہ سمجھے کوئی لیکن واقعہ یہ ہے
کہ ترکِ میکشی پر بھی وہی ہے میکشی اپنی

نگاہیں چار ہوتے ہی طلسمِ غیریت ٹوٹا
حقیقت سے حقیقت مان لی پہچان لی اپنی

جگر رہ جائے بن کر آہ جو اک کاسۂ سائل
نہ ایسی شاعری اپنی نہ ایسی زندگی اپنی

بیتاب ہی بیخواب ہی معلوم نہیں کیوں؟ — دل ماہیٔ بے آب ہی معلوم نہیں کیوں؟
بے کیفِ مئے ناب ہی معلوم نہیں کیوں — پھیکی شبِ مہتاب ہی معلوم نہیں کیوں؟
ساقی نے جو بخشا تھا بصد لطف و صد اصرار — وہ جرعہ بھی زہرآب ہی معلوم نہیں کیوں؟
کل تک یہی دُنیا سبدِ گُل تھی مگر آج — جیسے کہ یہ سب خواب ہی معلوم نہیں کیوں؟
جو ساز کہ خود نغمۂ عرفاں تھا اُسی کو — اندیشۂ مضراب ہے معلوم نہیں کیوں؟
دیکھا تھا کبھی خواب اُسے معلوم نہیں کیا — اب تک اثرِ خواب ہی معلوم نہیں کیوں؟
محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیر — میرے لیے بیتاب ہی معلوم نہیں کیوں؟

خلوت میں بھی جلوت میں بھی گھیرے ہوئے دل کو
اک شعلۂ بےتاب ہے معلوم نہیں کیوں؟

آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی — ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی
ہر منظرِ جمال دکھاتی چلی گئی — جیسے اُنھیں کو سامنے لاتی چلی گئی
ہر واقعہ قریب تر آتا چلا گیا — ہر شے حسین تر نظر آتی چلی گئی
ہر موجِ بحرِ حسن سے خود کھیلتی ہوئی — ہر آرزو کی پیاس بجھاتی چلی گئی
ہر درد کو بدلتی ہوئی انبساط سے — ہر غم کو خوشگوار بناتی چلی گئی
ویرانۂ حیات کے ایک ایک گوشے میں — جوگن کوئی ستار بجاتی چلی گئی
بے حرف و بے حکایت و بے ساز و بے صدا — رگ رگ میں نغمہ بن کے سماتی چلی گئی
کیفیتوں کو جوش سا آتا چلا گیا — بے کیفیوں کو جوش میں لاتی چلی گئی

کیا کیا نہ حسنِ یار سے شکوے تھے عشق کو　　کیا کیا نہ شرمسار بناتی چلی گئی

تفریقِ حُسن و عشق کا جھگڑا نہیں رہا　　تمیزِ قرب و بعد مٹاتی چلی گئی

میں تشنہ کام شوق تھا، پیتا چلا گیا　　وہ مست انکھڑیوں سے پلاتی چلی گئی

اک حُسنِ بے جہت کی فضائے بسیط میں　　اُڑتی چلی مجھے بھی اُڑاتی چلی گئی

پھر میں ہوں اور عشق کی بیتابیاں جگرؔ
اچھا ہوا وہ نیند کی ماتی چلی گئی

جلیل مانکپوری

جلیل مانک پوری

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے — فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

اٹھا ہوں میں جو دشت سے جانے کو اے جنوں — کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے

آنکھوں میں یوں ہی آ کے ابھی نکل گئے — کشتی بہ پشت میرے اشکِ رواں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے — جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

ذکرِ حبیب سے نہ ہو فرصت کبھی جسے — چلتا رہے یہ کام ہی جب تک زباں چلے

جلیل مانکپوری

سرگزشت

جلیل حسن نام، جلیلؔ تخلص، اور والد کا نام مولوی حافظ عبدالکریم ہے۔ ۱۲۸۳ھ میں بمقام مانکپور (اودھ) ولادت ہوئی۔ دس گیارہ سال کی عمر میں حفظِ قرآنِ مجید سے فراغت پائی۔ طلبِ علم کا بیشتر زمانہ لکھنؤ میں گزرا، اور وہیں عربی و فارسی میں استعداد بہم پہنچائی۔

سخن گوئی کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ بیس سال کی عمر میں امیرؔ مینائی کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور جملہ ضروریات و مستحسناتِ شعری حضرتِ امیرؔ ہی کے فیضانِ صحبت سے حاصل کیے۔ رام پور میں امیر اللغات کی تدوین کے لیے دفتر کھولا گیا، تو اُس کی ادارت ان کے سپرد ہوئی۔ سفرِ بنارس و بھوپال وغیرہ میں بھی حضرتِ امیرؔ کے ہمرکاب رہے۔ ۱۰ر جنوری ۱۳۱۸ھ کو اُستاد کے ہمراہ حیدر آباد پہنچے۔ اُس زمانے میں یمین السلطنۃ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی اعانت اور مہماں نوازی شاملِ حال رہی۔ حضرتِ امیرؔ کی وفات کے بعد ۱۳۲۷ھ میں غفراں مکان نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظامِ دکن نے اپنی اُستادی کا شرف بخشا اور داؔغ مرحوم کی جگہ پر مامور

فرماکر "جلیل القدر" کے معزز خطاب سے سرفراز کیا۔

حضورِ پُر نور نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہِ سابع، خلداللہ ملکہٗ جب سریر آرائے سلطنت ہوئے، تو اُنھوں نے بھی اپنی اُستادی کے شرف سے مشرف فرمایا، اور پہلے "نواب فصاحت جنگ بہادر" کے خطاب سے سرفراز کیا، پھر "امام الفن" کے لقب سے مزید عزت افزائی فرمائی۔ شہزادے بھی حسب الحکم سرکار اپنا کلام اِنھیں کو دکھاتے ہیں۔

جنابِ جلیلؔ حیدر آباد سے دو رسالے "محبوب الکلام" اور "دبدبۂ آصفی" نکالتے رہے ہیں۔ ایک مبسوط رسالہ تذکیر و تانیثِ الفاظ پر بھی تصنیف کیا ہے، جو مولانا عبد الحلیم شررؔ لکھنوی کے مقدمے کے ساتھ چھپ چُکا ہے۔ منظوم تصانیف حسبِ ذیل ہیں:-

۱۔ تاجِ سخن پہلا دیوان، جو پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء میں طبع ہوا۔
۲۔ جانِ سخن دوسرا دیوان، جو پہلی مرتبہ ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔
۳۔ روحِ سخن تیسرا دیوان، جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔
۴۔ سرتاجِ سخن قصائدِ مدحیہ، قطعات اور تاریخوں کا مجموعہ ہے۔
۵۔ معراجِ سخن نعتیہ کلام اور سلام وغیرہ کا مجموعہ ہے۔
۶۔ گُلِ صد برگ رباعیات کا مجموعہ ہے۔

اُردو کی ترویج کے متعلق اِن کا خیال ہے کہ فی زمانہ جو کچھ ہو رہا ہے وہی طریقہ مناسب ہے، یعنی نظم و نثر میں تصنیف و تالیف کا بکثرت ہونا اُردو کے قواعد مرتب کیے جانا اور اُردو کے لغات کا مدون ہونا۔

ہندی اور سنسکرت وغیرہ کے جو الفاظ اُردو میں شامل ہوگئے ہیں اِن کے خیال میں بس وہی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

مفرد اشعار میں ردیف و قافیہ کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے، مگر قطعہ، نظم، غزل، مثنوی وغیرہ میں قافیہ ضروری سمجھتے ہیں، البتہ ردیف کا معاملہ اختیاری ہے۔

اساتذۂ اردو کے حسب ذیل اشعار آپ کو پسند ہیں:

آتش
بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

"
وعدہ خلاف یار سے کہیو یہ نامہ بر
آنکھوں کو روگ دے گئے ہو انتظار کا

امیر مینائی
بڑے مزے سے گزرتی ہے بیخودی میں امیر
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

داغ
بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لیے

ذوق
اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ریاض خیرآبادی
رخ پرنور میں جگہ تھی کہاں
رکھنے والے کو دیکھیے تل کے

رند
منہ پہ رکھ دامن گل روئیں گے مرغان چمن
خاک اڑائے گی گلستاں میں صبا میرے بعد

سودا
کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

غالب — اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے مُنھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

میر — اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ناسخ — یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہے
وگرنہ ماہ کو اک شب کمال رہتا ہے

انتخابِ کلام

کسی کا حُسن اگر بے نقاب ہو جاتا
نظامِ عالمِ ہستی خراب ہو جاتا

نگاہِ لطف نہیں اُن کی - خیر ہی ورنہ
کچھ اور حال ہمارا خراب ہو جاتا

جو آپ آتے تو دنیا مری بدل جاتی
خوشی ملال، سکوں اضطراب ہو جاتا

نظارۂ رُخِ دلدار ہر طرح دشوار
نقاب اُٹھتی تو حائل حجاب ہو جاتا

ہزار ہنستے رہے گُل، مگر نہ تھا ممکن
کہ میرے زخمِ جگر کا جواب ہو جاتا

جو موت کا نہ محبت میں آسرا ہوتا
کسی حسین پہ مرنا عذاب ہو جاتا

اگر میں ہوش میں ہوتا تو یہ طلسمِ جہاں
مری نگاہ میں بھولا سا خواب ہو جاتا

وہ آنے والے ہیں شب کو یہ چاہتا ہوں جلیل
غروب شام سے قبل آفتاب ہو جاتا

ہوا اچھا مرے حق میں جنوں کا جوش ہو جانا
وہ کہتے ہیں کہ اب بیکار ہے روپوش ہو جانا

بھلا دیتا ہے ساری کلفتیں شبہائے ہجراں کی
تصور میں کسی کا زینتِ آغوش ہو جانا

دمِ نظارہ آتی ہی حیا، اے جاں تو آنے دو
مری پلکوں کی چلمن ڈالکر روپوش ہو جانا

حقیقت میں پتہ دیتا ہے در پردہ محبت کا
جلیل اُن کا تمھارے نام پر خاموش ہو جانا

جس دن سے بلبلیں سوئے دامِ قفس گئیں
نظارۂ بہارِ چمن کو ترس گئیں

قاصد پیامِ شوق کو دینا بہت نہ طول
کہنا فقط یہ اُن سے کہ آنکھیں ترس گئیں

گم کون قافلے سے ہوا جس کے واسطے
جانیں نکل کے صورتِ بانگِ جرس گئیں

گزریں جو اِس طرف سے حسینوں کی ٹکڑیاں
کچھ رو گئیں، تو کچھ مرے رونے پہ ہنس گئیں

بزمِ نشاط و عیش کا اب ذکر کیا، جلیل
وہ دن گئے وہ راتیں بھی ای ہم نفس گئیں

رِندوں کو غمِ بادۂ گلفام نہیں ہے
آنکھیں تو ہیں ساقی کی اگر جام نہیں ہے

کٹتی ہے نہ گھٹتی ہے نہ ہٹتی ہے شبِ غم
اِس پر اثرِ گردشِ ایام نہیں ہے

جب تک خلشِ درد تھی اک گونہ مزا تھا
جب سے مجھے آرام ہے، آرام نہیں ہے

چلنے کی اجازت ہے، فقط تیغِ رواں کو
قاتل کی گلی رہگذرِ عام نہیں ہے

تم یاں سے گئے کیا، مری دُنیا ہی بدل دی
وہ لطف نہیں، وہ سحر و شام نہیں ہے

کچھ دام و قفس پر نہیں موقوف اسیری
بلبل کے لیے کیا رگِ گل دام نہیں ہے

نادان ہیں جو دیتے ہیں جلیل آپ کو الزام
اِس دَور میں کس کو ہوسِ جام نہیں ہے؟

جن کے جلوے پہ سرِ طور نظر آتے ہیں
دل کے پردے میں وہ مستور نظر آتے ہیں

کھینچ دی خلد کی تصویر بہارِ گل نے — پھول جتنے ہیں رُخِ حور نظر آتے ہیں
کس کا میں دیکھنے والا ہوں؟ نہ پوچھو یہ کلیم — اِک نظر میں مجھے سو طور نظر آتے ہیں
تھک گیا قافلۂ زیست بھی چلتے چلتے — اب بھی منزل کے نشاں دور نظر آتے ہیں

ہر نظر اُس کی چھلکتا ہوا ساغر ہے جلیل
آج ہم پینے پہ مجبور نظر آتے ہیں

زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے — یہ دریا ہے کہ بہتا جا رہا ہے
وہ اُٹّھے، درد اُٹّھا، حشر اُٹھا — مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے
لگی تھی اُن کے قدموں سے قیامت — میں سمجھا ساتھ سایہ جا رہا ہے
بہار آئی کہ دِن ہولی کے آئے — گلوں میں رنگ کھیلا جا رہا ہے
مرے داغِ جگر کو پھول کہہ کر — مجھے کانٹوں میں کھینچا جا رہا ہے
رواں ہے عمر اور انسان غافل — مسافر ہے کہ سویا جا رہا ہے

جلیلؔ اب دل کو اپنا دل نہ سمجھو
کوئی کر کے اِشارا جا رہا ہے

بہاریں لُٹا دیں جوانی لُٹا دی — تمھارے لیے زندگانی لُٹا دی
صبا نے تو برسائے گل فصلِ گُل میں — گھٹا نے مئے ارغوانی لُٹا دی
اداؤں پہ کر دی فدا ساری ہستی — نگاہوں پہ دنیائے فانی لُٹا دی
عجب حوصلہ ہم نے غنچوں کا دیکھا — تبسّم پہ ساری جوانی لُٹا دی
نہ کی حُسن کی قدر اے ماہِ کامل — فقط رات بھر میں جوانی لُٹا دی
جلیلؔ آپ کی شاعری پر کسی نے — نگاہوں کی جادو بیانی لُٹا دی

دل مستِ محبت نہ بہت جوش میں آئے
دیوانے سے کہدو کہ ذرا ہوش میں آئے

سمجھا میں یہی جھومتی آئیں جو گھٹائیں
میخانے کو میکش لیے آغوش میں آئے

کھلتا ہے اِس انداز سے گُل شاخِ چمن میں
جیسے کوئی ساغر کفِ مے نوش میں آئے

حاجت نہ رہی عرضِ تمنّا کی زباں سے
جذبات کچھ ایسے لبِ خاموش میں آئے

سُنتے ہیں جلیل آج ہوئے تارکِ صہبا
ہو شکر کی جا اب بھی اگر ہوش میں آئے

ادا ادا تری موجِ شراب ہو کے رہی — نگاہِ مست سی دنیا خراب ہو کے رہی

تری گلی کی ہوا دل کو راس کیا آتی — ہوا یہ حال کہ مٹی خراب ہو کے رہی

ہماری کشتیٔ توبہ کا یہ ہوا انجام — بہار آتے ہی غرقِ شراب ہو کے رہی

وہ آہِ دل جسے سُن سُن کے آپ ہنستے تھے — خدنگِ ناز کا آخر جواب ہو کے رہی

کسی میں تاب کہاں تھی کہ دیکھتا اُس کو — اُٹھی نقاب تو حیرت نقاب ہو کے رہی

وہ بزمِ عیش جو رہتی تھی گرم راتوں کو — فسانہ ہو کے رہی ایک خواب ہو کے رہی

جلیل فصلِ بہاری کی دیکھیے تاثیر
گری جو بوند گھٹا سے شراب ہو کے رہی

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی — کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

دل لیا پہلی نظر میں آپ نے — اب ادا کوئی نہ خالی جائے گی
آتے آتے آئے گا اُن کا خیال — جاتے جاتے بے خیالی جائے گی
اے تمنّا تجھ کو رو لوں شامِ وصل — آج تو دل سے نکالی جائے گی
قبر میں بھی ہوگا روشن داغِ دل — چاند پر کیا خاک ڈالی جائے گی
گر یہی نظارہ بازی کا ہے شوق — باغ سے نرگس نکالی جائے گی
دیکھتے ہیں غور سے میری شبیہ — شاید اس میں جان ڈالی جائے گی

فصلِ گُل آئی جنوں اُچھلا جلیل
اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

اِس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے — فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے
اپنی ادائے نیم نگاہی کا واسطہ — لے بیخبر، خبر کہ ترے نیم جاں چلے
اُٹھتا ہوں میں جو دشت سے جانے کو اے جنوں — کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے
آنکھوں میں کون آ کے الٰہی نکل گیا — کس کی تلاش میں مرے اشک رواں چلے

ذکرِ حبیب سے ہو نہ غفلت کبھی جلیل
چلتا رہے یہ کام بھی جب تک زباں چلے

موسمِ گل میں عجب رنگ ہے میخانے کا — شیشہ جھکتا ہے کہ مُنھ چوم لے پیمانے کا
خوب انصاف تری انجمنِ ناز میں ہے — شمع کا رنگ جمے خون ہو پروانے کا
اُٹھ گئے آپ جو پہلے سے قیامت آئی — ہِل گیا درد کو پہلو مرے تڑپانے کا
میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی — کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا
رات بھر حسرتِ آتش سے جلا کرتی ہے — شمع پر صبر پڑا ہے کسی پروانے کا

جان دیدے نہ کرے آہ، بہت مشکل ہے　　عشق کرنے کو جگر چاہیے پروانے کا

صحبتِ پیرِ مغاں میں یہ کھلا راز جلیل
خلد کہتے ہیں جسے نام ہے میخانے کا

مزے بیتابیوں کے آ رہے ہیں　　وہ ہم کو ہم انھیں سمجھا رہے ہیں
ابھی کل تک تھی کیسے بھولے بھالے　　ذرا ابھرے ہیں آفت ڈھا رہے ہیں
وہ بجلی ہیں تو ہوں اُن کو مبارک　　مجھے کس واسطے تڑپا رہے ہیں
ہمارا حال جب دیکھا تو بولے　　سزا اپنے کیے کی پا رہے ہیں

کبھی ہم نے پیا تھا بادۂ عشق
جلیل اُس کے مزے اب آ رہے ہیں

جوش ملیح آبادی
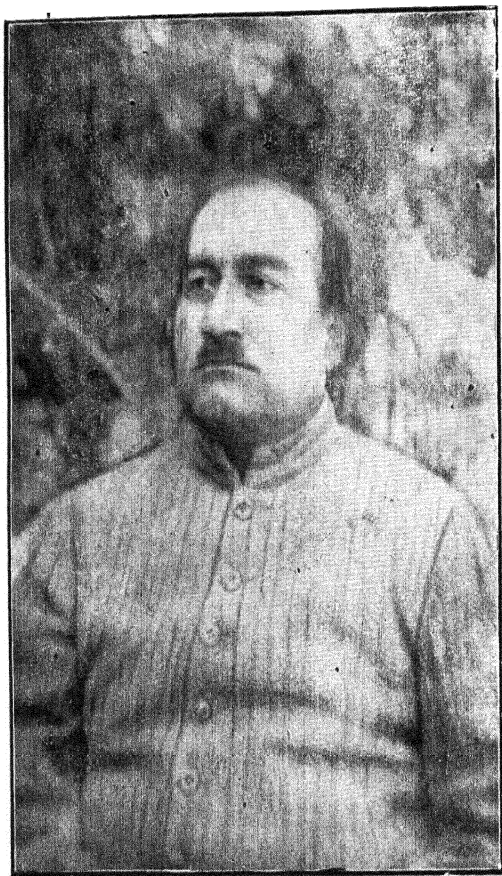
جوش ملیح آبادی

پروگرام

اے شخص اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈنا چاہے — وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا

اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت — طرفِ چمن و صحنِ گلستاں میں ملے گا

اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی — بزمِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا

اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خوش اوقات — رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا

اور رات کو وہ خلوتیِ کاکل و رخسار — بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا

اور ہو گا کوئی جبر، تو وہ بندۂ مجبور
مُردے کی طرح خانۂ ویراں میں ملے گا

جوشؔ
۶ر فروری ۱۹۴۱ء
رام پور

جوش ملیح آبادی

سرگزشت

شبیر حسن خاں نام، جوش تخلص اور ۱۸۹۶ء سالِ ولادت ہے۔ ان کے اسلاف کابل سے آکر قائم گنج ضلع فرخ آباد میں سکن پذیر ہوئے اور ایک عرصۂ دراز کے بعد ملیح آباد چلے آئے۔ ان کے والد نواب بشیر احمد خاں، دادا نواب محمد احمد خاں اور پردادا نواب فقیر محمد خاں تھے۔ موخر الذکر شاعر بھی تھے، اور گویا تخلص کرتے تھے۔ اس خاندان کے بیشتر افراد سلطنتِ اودھ میں معزز عہدوں پر فائز رہے ہیں۔

جوش کی عربی و فارسی کی تعلیم مکان پر ہوئی، انگریزی سینیر کیمبرج تک پڑھی۔ شعر گوئی کا جذبہ ۱۲، ۱۳ سال کی عمر سے ابھر چلا تھا۔ ابتدائی کلام حضرتِ عزیز لکھنوی کو دکھایا۔ اب جدّتِ طبیعت و جوشِ فطرت رہنما و مصلحِ خیال ہے۔

جوش گندمی رنگ کے، فراخ چشم، کشادہ پیشانی، اور اچھے خط و خال کے انسان ہیں۔ چہرے کی ساخت سے اولوالعزمی، اور تدبر ٹپکتا ہے۔ درمیانی قد، بڑا سر، اور دوہرا جسم ہے۔ سر کے بال بڑے رکھتے ہیں۔ آواز میں شکوہ و دبدبہ اور گفتگو میں تسخیرِ قلوب کی غیر معمولی

قوت ہے۔ دوست پسند، احباب نواز، فکرِ امروز و غمِ فردا سے بے نیاز، اور بہت جلد گھل مل جانے والے ہیں۔

اِن کا خیال ہے کہ مجموعی حیثیت سے وہ شاعری بہتر ہے، جو انسانی ذہنیت کو ارتقا و قوتِ عمل بخشنے والی ہوسکتی ہو۔

اُردو کی ترقی و ترویج کے بارے میں یہ رائے ہے کہ بکثرت کتابیں ترجمہ اور تالیف کی جائیں، انجمنیں بنائی جائیں، نئے اسلوب اختیار کیے جائیں اور زیادہ تفکر سے کام لیا جائے۔

اُردو زبان میں ہندی اور سنسکرت کے اُن الفاظ کے شمول سے متفق ہیں جن سے شعریت مجروح نہ ہو۔ اسی طرح ردیف و قافیہ کی پابندیاں اِن کے نزدیک اس حد تک روا ہیں کہ شعر میں نقص و تنزل پیدا نہ ہو، ورنہ بغیر اس التزام کے کہنا مناسب ہے۔ لیکن خود اِن کے جملہ کلام میں ردیف و قافیہ کی پابندیاں موجود ہیں۔

دیگر اساتذہ کے یہ شعر اِنھیں پسند ہیں:۔

میر
کہا میں نے "گُل کا ہے کتنا ثبات"
کلی نے یہ سُن کر تبسّم کیا

غالب
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

مومن
جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا
کہ تو نے کس توقع پر وفا کی

"
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

فراقؔ — خدا کو اہلِ جہاں جب بنا چکے، تو فراقؔ
پکار اُٹھے کہ خدا نے ہمیں بنایا ہے

نظم میں نظیر اکبر آبادی اور علامہ اقبال کو اُستاد مانتے ہیں۔ غزل کو غیر فطری تصور کرتے ہیں، اس لیے اس صنف میں کسی کو اُستاد نہیں مانتے۔ البتہ غزل کہنے والوں میں مومن خاں کے تغزل کو محدود معنیٰ میں بہتر سمجھتے ہیں۔

اِن کا خیال ہے کہ غزل گوئی ترک کر کے نظمیں کہنا چاہیے، خواہ وہ کسی صنف کی ہوں۔

جنابِ جوش کی منظوم تصانیف حسبِ ذیل ناموں سے طبع ہو چکی ہیں:۔

(۱) روحِ ادب (نثر، غزل اور نظم کا مجموعہ)

(۲) نقش و نگار
(۳) شعلہ و شبنم
} (نظم و غزل کے مجموعے)

(۴) حرف و حکایات
(۵) جنونِ حکمت
(۶) فکر و نشاط
(۷) آیات و نغمات
} (نظموں کے مجموعے)

انتخابِ کلام

اُٹھی وہ گھٹا رنگ سامانیاں کر
گہرپاشیاں کر زرافشانیاں کر

وہ چھلکے عنادل وہ سنکیں ہوائیں
گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر

صُراحی جُھکا اور دُھومیں مچادے
گلابی اُٹھا اور گُل افشانیاں کر

مٹا داغِ ہوش اور مدہوش بنجا
اُٹھا جامِ زر اور سُلطانیاں کر

نگاہوں سے برسا دے ابرِ جوانی
مے لالہ گوں سے گلستانیاں کر

سمندر پہ چل اور الیاس بنجا
ہواؤں پہ اُڑ اور سُلیمانیاں کر

صبا کی طرح کنج میں رقص فرما
بگولوں کی مانند جولانیاں کر

سکوں پاؤں چومے وہ ہلچل مچادے
خِرد سر جُھکا دے، وہ نادانیاں کر

علم کھول کر جوشِ بدمستیوں کے
جہاں داریاں کر، جہاں بانیاں کر

کل رات کو

دیدنی تھا میری محفل کا سماں کل رات کو
مہرباں تھا وہ بتِ نامہرباں کل رات کو

ناز، تھا طغرا کشِ دیوانِ آدابِ نیاز
تیغ، تھی بغیرِ امن وا ماں کل رات کو

چھو رہی تھی دل کو موجِ رنگ تیور کے عوض
کھنچ رہی تھی ابروؤں کی یوں کماں کل رات کو

لوٹتی تھی کس تکلف سے ہوا کے دوش پہ
چاندنی میں کاکلِ عنبر فشاں کل رات کو

الاماں ٹھنڈی ہوا کے گدگدانے کی ادا
ہر کلی کو آ رہی تھیں ہچکیاں کل رات کو

مسندِ زریں پہ سِرِّ دلبراں کے زمزمے — تھے باندازِ حدیثِ دیگراں کل رات کو

کاکلیں لہرا رہی تھیں روئے عالمتاب پر — سُنبلستاں کا تھا گُل پر سایباں کل رات کو

پھُول تھے غرقِ عرق، پانی ہوئے جاتے تھے جام — سُرخ تھیں اُس شوخ کی یوں انکھڑیاں کل رات کو

آ رہی تھی جنبشِ مژگانِ عالم کی صدا — یوں لبِ گل رنگ تھا افسانہ خواں کل رات کو

کیا تلاطم تھا کہ میری کشتیٔ امید میں — کاکلِ شبرنگ تھا یا بادباں کل رات کو

غیب کے پردے سے آوازیں مبارکباد کی — آ رہی تھیں کارواں در کارواں کل رات کو

سامنے تھی جلوہ گاہِ کُرسی و لوح و قلم — اک دریچہ بن گیا تھا آسماں کل رات کو

ہر سخن میں گونجتی تھی اسمِ اعظم کی صدا — ہر نفس تھا اک حیاتِ جاوداں کل رات کو

وقت کے ہاتھوں پہ روشن تھیں ابد کی مشعلیں — ایسی اک منزل میں تھی عمرِ رواں کل رات کو

وہ ترنم تھا کہ علم و عقل کے ہوتے ہوئے — زیست کی ہر شے تھی اک جنسِ گراں کل رات کو

چاندنی، دریا، شگوفے، راگنی، ربط، شراب — چھٹ رہی تھیں نرم پر رنگینیاں کل رات کو

نرگسِ مخمور و آبِ آتشین و موجِ گل — ہر طرف تھیں سُرخیاں ہی سُرخیاں کل رات کو

گردنِ مینا جھکاتے ہی اُبل پڑتے تھے جام — گنگنا اُٹھتا تھا یوں پیرِ مغاں کل رات کو

وجد میں تھی جھلملاتی مشعلوں میں روشنی — رقص میں تھا پرتوِ رطلِ گراں کل رات کو

ناز کرتی جسطرح جاتی ہے گردوں پر دعا — اُٹھ رہا تھا مشعلوں سے یوں دھُواں کل رات کو

محفلِ زہرا میں تھا ہنگامۂ رقص و سرود — آسماں پر بج رہی تھیں چوڑیاں کل رات کو

میں بھی لافانی ہوں مثلِ وجہِ ربِ ذوالجلال — دل کو ہوتا تھا یہ رہ رہ کر گماں کل رات کو

جوشؔ کے پہلو میں تھیں ارض و سما کی نعمتیں
حیف! اک تو ہی نہ تھا اے رازداں کل رات کو

رباعی

آزادیٔ فکر و درسِ حکمت ہے گناہ — دانا کے لیے نہیں کوئی جائے پناہ
اِس اژدرِ تہذیب کے فرزندِ رشید — یہ مذہب و قانون، عیاذًا باللہ!

رباعی

دل ہوتا ہے رو براہ گاہے گاہے — رو لیتے ہیں بھر کے آہ گاہے گاہے
اِس ڈر سے کہیں خودی نہ بن جائے خدا — کر لیتے ہیں ہم گناہ گاہے گاہے

رباعی

نومیدیٔ نظارۂ انوار بھی جہل — امیدِ شہود و شوقِ دیدار بھی جہل
اک قادرِ مطلق کا جہاں تک ہے سوال — انکار بھی جہل ہے اور اقرار بھی جہل

سرشکِ تبسّم

اُٹھا ساغر کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی
یہ بربط ہے، یہ مے ہے، آگے خدا کا نام ہے ساقی
نہ جانے نوعِ انساں کیوں اجل سے خوف کھاتی ہے
اجل کہتے ہیں جس کو زحمتِ یک گام ہے ساقی

حقیقت کیا سمجھ میں آسکے اشیائے عالم کی
فقط اک شکل ہے ساقی فقط اک نام ہے ساقی

سناؤں سازِ حکمت کے ترانے کس توقع پر
کہ ابتک نوعِ انساں بندۂ اوہام ہے ساقی

اُدھر یہ قول ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی
اِدھر ابتک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی

اُدھر شدت کے ساتھ اعلان ہے اتمامِ نعمت کا
اِدھر ہر سانس ابتک زہر کا اک جام ہے ساقی

کہا جاتا ہے مجھ سے زندگی انعامِ قدرت ہے
سزا کیا ہو گی اُس کی جس کا یہ انعام ہے ساقی

شکایت کیا کسی خوں ریز چنگیز و ہلاکو کی
خود اپنا دل ہی جب خوں ریز و خوں آشام ہے ساقی

عمل کا رستہ ہے جب دستِ ماحول و وراثت میں
تو پھر کیوں آدمیت موردِ الزام ہے ساقی

جسے کہتے ہیں عرفِ عام میں تخلیقِ انسانی
یہ کس آغاز کی سعیِ زبوں انجام ہے ساقی

یہ کس کی مُہرِ ہیبت ثبت ہے گیتی کے سینے پر
کہ ہر ذرّہ ازل سے لرزہ بر اندام ہے ساقی

لڑکپن ضد میں روتا تھا، جوانی دل کو روتی ہے
نہ جب آرام تھا ساقی، نہ اب آرام ہے ساقی
تمنّائیں جگاتی ہیں، تو ناکامی سُلاتی ہے
نہ اپنی صبح ہے ساقی، نہ اپنی شام ہے ساقی
وہاں بخشا گیا ہے میرے دل کو ذوقِ آزادی
جہاں موجِ ہوا تک مُرغِ زیرِ دام ہے ساقی
تبسّم اک بڑی دولت ہے میں بھی اس کا قائل ہوں
مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی
جسے اربابِ مذہب بادۂ توحید کہتے ہیں
وہ آبِ صاف بھی افشردۂ اصنام ہے ساقی
ادب کر اُس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیّام ہے ساقی

فکر ہی ٹھہری تو دل کو فکرِ خوباں کیوں نہ ہو
خاک ہونا ہے تو خاکِ کوے جاناں کیوں نہ ہو
زیست ہے جب مستقل آوارہ گردی کا ہی نام
عقل والو، پھر طوافِ کوے جاناں کیوں نہ ہو
جب نہیں مستوریوں میں بھی گناہوں سے نجات
دل کھُلے بندوں غریقِ بحرِ عصیاں کیوں نہ ہو

حیف بشر کی دست رس سے دور ہی حبل المتین
دستِ وحشت میں پھر اک کافر کا داماں کیوں نہ ہو

ایک ہے جب شورِ جہل و بانگِ حکمت کا مآل
دل ہلاکِ ذوقِ گلبانگِ پریشاں کیوں نہ ہو

اِک نہ اِک رفعت کے آگے سجدہ لازم ہے تو پھر
آدمی محوِ سجودِ سروِ خوباں کیوں نہ ہو

اِک نہ اِک پھندے ہی میں پھنسنا ہی جب انسان کو
دوش پر دامِ سیاہِ سنبلستاں کیوں نہ ہو

جب فریبوں ہی میں رہنا ہے تو اے اہلِ خرد
لذتِ پیمانِ یارِ سست پیماں کیوں نہ ہو

اِک نہ اِک ظلمت سے وابستہ ہی رہنا ہے تو جوش
زندگی پر سایۂ زلفِ پریشاں کیوں نہ ہو

قدیم رنگ تغزل

سوزِ غم دیکے مجھے اُس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا

اے میں سو جان سے اس طرزِ تکلم کے نثار
پھر تو فرمائیے، کیا آپ نے ارشاد کیا

اِس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد
اِس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا

اتنا مانوس ہوں فطرت سے، کلی جب چٹکی
جُھک کے میں نے کہا: کیا مجھ سے کچھ ارشاد کیا

میں نے ہر لطف کے موقع پہ تجھے یاد کیا
میری ہر سانس ہے اس بات کی شاہد ہے دوست

لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا
مجھ کو تو ہوش نہیں، تم کو خبر ہو شاید

کچھ نہیں اس کے سوا جوشؔ حریفوں کا کلام
وصل نے شاد کیا، ہجر نے ناشاد کیا

حسرت موہانی

۱۸ نومبر سنہ ۱۹۴۱ء

حسرت موہانی

حسرت موہانی

سرگزشت

سید فضل الحسن نام، اور حسرت تخلص ہے۔ قصبۂ موہان ضلعِ اُناؤ میں ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔

قرآنِ مجید اور اُردو فارسی کی تعلیم مولانا غلام علی موہانی وغیرہ سے گھر پر حاصل کی۔ اِس کے بعد اُردو مڈل پاس کیا۔ عربی کی کتابیں مولانا سید ظہور الاسلام، بانیٔ مدرسۂ اسلامیہ فتح پور، سے پڑھیں فتح پور ہی سے انٹرنس پاس کرکے وظیفہ حاصل کیا، اور علیگڑھ کالج میں داخل ہوکر ۱۹۰۳ء میں بی،اے، کی ڈگری حاصل کی۔

مولانا حسرت کا، درمیانی قد، معمولی نقشہ، گول چہرہ اور پکّا رنگ ہے۔ اِن میں اخلاقِ اسلامی قدما کی طرح جلوہ گر ہے۔ مزاج کی سادگی، حوصلے کی بلندی، یقین کی استواری، حق پسندی، صدق و صفا اور زہد و تقویٰ سے متصف ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد رسالۂ اُردوے معلّیٰ نکالا، جو دنیاے ادب و سیاسیات میں محتاجِ تعارف نہیں۔

ادبی و سیاسی مذاق ابتدا ہی سے نہایت صحیح اور سلیم ہے۔ شاعری میں تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہیں۔

باوجود چند در چند مجبوریوں کے وجاہت طلبی کی طرف سے مولانا نے اپنی آنکھیں بند کرلی ہیں، اور قومی خدمت گزاری کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر، معاشرتی دنیا کو قانعانہ اور متوکلانہ طریق پر نہایت محدود و مختصر کر لیا ہے۔

مذہبًا حنفی ہیں اور مشربًا قادری۔ بچپن میں شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت کی تھی۔ بعد ازاں اُن کے صاحبزادے سے، جو حضرت مولانا عبدالباری صاحب کے والد ماجد تھے، تجدید بیعت کی۔ تقریبًا آٹھ دس بار زیارتِ بیت اللہ شریف سے مشرف ہو چکے ہیں۔

مولانا نے اُردو لٹریچر کی نہایت گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، خصوصًا اُردو شاعری پر اِن کا احسانِ عظیم ہے۔ اکثر غیر معروف شعرا کے حالات اور کلام سے لوگوں کو آشنا کیا، اور اس طرح بہت سے اساتذہ کے کلام کو تلف ہونے سے بچالیا؛ شعرا کے تذکرے مرتب کرکے شایع کیے، اور اُن کے کلام پر تنقیدیں لکھیں، جس سے پاکیزہ مذاقِ سخن کی اشاعت ہوئی۔

اُردو زبان میں ہندی اور سنسکرت کے وہی الفاظ استعمال کرنا مناسب سمجھتے ہیں، جو عام طور پر رواج پاچکے ہیں۔

اِن کے نزدیک غزل صرف عاشقانہ خیالات کے لیے مناسب ہے، دیگر مضامین کے اظہار کے لیے اِسے استعمال کرنا زیبا نہیں۔ اِن کا یہ بھی خیال ہے کہ اشعار میں قافیہ نہ ہو تو چنداں مضایقہ نہیں، لیکن

ردیف کا ہونا از بس ضروری ہے۔

دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار یہ ہیں:-

میر
یاد اُس کی اتنی خوب نہیں، میر، باز آ
نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائیگا

"
تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

مصحفی
ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا

مومن
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سیاست کی بدولت اِن کو متعدد بار جیل میں رہنا پڑا ہے اور زنداں کی صعوبتوں سے مستقل طور پر دو چار رہ چکے ہیں۔ لیکن ارادہ کا استقلال اور خیالات کی استواری میں کبھی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ ایک بار جیل میں یہ مطلع کہا تھا ؎

ہے مشقِ سخن جاری، چکّی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

موصوف نے اپنا کلام سُنانے سے قبل بطورِ تمہید ایک تقریر میں دنیائے تغزل کو دو حصوں پر منقسم کیا، "آمد" اور "آورد"، پھر دونوں کو چار ابواب پر تقسیم کیا:-

اور مذکورہ بالا عنوانات کے تحت ہر ایک رنگ کے نمایاں غزل گو شعرا کے نام بتائے اور اسی ترتیب سے اپنا کلام تقسیم فرماتے ہوئے سامعین کو محظوظ فرمایا۔
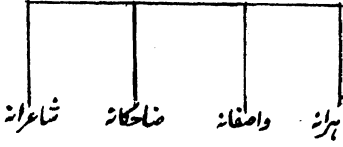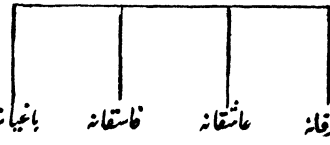
انتخابِ کلام

منظرِ شانِ کبریا صَلِّ علیٰ محمّدٍ — آئینۂ خدا نما صَلِّ علیٰ محمّدٍ
موجب نازِ عارفاں باعثِ فخرِ صادقاں — سرور و خیرِ انبیا صل علیٰ محمّدٍ
مرکزِ عشقِ دلکشا مصدرِ حسنِ جاں فزا — صورت و سیرتِ خدا صل علیٰ محمّدٍ
مونسِ دل شکستگاں پشت پناہِ خستگاں — شافعِ عرصۂ جزا صل علیٰ محمّدٍ

حسرتؔ اگر رکھے ہے تو بخشش حق کی آرزو
وردِ زباں رہے سدا صل علیٰ محمّدٍ

تری یاد بے اختیار آ رہی ہے — تمنا کی فصلِ بہار آ رہی ہے
حرم سے ہوا خوشگوار آ رہی ہے — دوائے دلِ بیقرار آ رہی ہے
ترے کہنہ ملبوس کی دھجی دھجی — پئے راحتِ جاں بکار آ رہی ہے
کہوں حال کیا اُسکی جاں پروری کا — جو کعبے سے خوشبوئے یار آ رہی ہے

ہوس دل کی اُن سے جُدا ہو کے حسرتؔ
سراسیمہ و اشکبار آ رہی ہے

میسّر ہی شاہِ نجف کی غلامی — زہے کامرانی زہے شادمانی
ملے مجکو بھی مثلِ سلمانؓ و بوذر — وہی خواجہ تاشی وہی نیکنامی
وہ بیخوفِ غم کیوں نہو بن گئے ہوں — حقیقت میں شیرِ خدا جسکے حامی
پہنچ کر درِ شاہِ مرداں پہ اکثر — خصوصی شرف پاگئے ہم سے عامی
نظر آئے مولا کے روضے پہ حسرتؔ — عقیدت کے انوارِ حق مثلِ جامی

دل ہیں نازاں کہ تری صورتِ زیبا دیکھی
آنکھ حیران کہ اک حُسن کی دنیا دیکھی

پہلے آنکھیں ہوئیں گرویدہ پھر آنکھوں کی طرح
چاہنے دل بھی لگا آپ کو دیکھا دیکھی

زلفِ شبرنگ پہ گلنار لباسی کی بہار
آج حسرت نے رُخِ یار میں کیا کیا دیکھی

نامرادوں کو شادکام کرو
کرم اپنا کبھی تو عام کرو

کارِ عاشق ہے ناتمام سو تم
قتل کرکے اُسے تمام کرو

سب کی خاطر کا ہی خیال نہیں
کچھ ہمارا بھی انتظام کرو

کُھل سکے جب تلک نہ راہِ مُراد
منزلِ صبر ہیں قیام کرو

پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو
تم بھی حسرت اُٹھو سلام کرو

کرمِ ساقیٔ میخانہ مُبارک باشد
گرمیٔ مجلسِ رندانہ مُبارک باشد

عید ہے آج کا دن بادہ پرستوں کیلیے
عشرتِ گردشِ پیمانہ مُبارک باشد

جس کے دیدار کی مدت سے تمنّا تھی سو آج
ہے وہی رونقِ کاشانہ مُبارک باشد

دلفروشانِ تماشا کو بصد عیش و نشاط
دولتِ جلوۂ جانانہ مُبارک باشد

جانِ حسرت کے لیے مایۂ نازش ہے یہی
اضطرابِ دلِ دیوانہ مُبارک باشد

عشق میں خوفِ جاں سے درگزرے
ہم نے ٹھانی جو دل میں کر گزرے

زندگی اپنی ، ہو کے اُن سے جُدا — سخت گزرے گی اب اگر گزرے
شامِ فرقت کٹے نہ ہجر کی رات — صبح گزرے نہ دوپہر گزرے
زندگی ہے اسی کا نام تو ہم — ایسی درماندگی سے درگزرے
اُن کے قدموں پہ رکھ دیا سرِ شوق — ہم یہ کیا بیخودی میں کر گزرے

منتظر ہے متاعِ جاں حسرت
کہ اِدھر بھی وہ فتنہ گر گزرے

کوچہ اُس فتنۂ دوراں کا دکھا کر چھوڑا — دل نے آخر ہمیں دیوانہ بنا کر چھوڑا
پردہ ہم سے جو وہ کرتے تھے نہ کرنے پائے — شوقِ بیباک نے اُس کو بھی اُٹھا کر چھوڑا
بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے — ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا
تجھ سے ملنے پہ کسی کی ہمیں پروا نہ رہی — سب کو دنیا میں تری یاد لگا کر چھوڑا

مرگِ حسرت کا بہت رنج کیا آخر کار
اثرِ عشق نے اُن کو بھی رُلا کر چھوڑا

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا — شغل بیکار ہیں سب اُن کی محبت کے سوا
دے سکا کوئی نہ دہری کے وساوس کا جواب — تیرے وارفتۂ دیوانہ طبیعت کے سوا
کون رکھے گا ترے غم سے دل و جاں کو عزیز — کچھ نہیں اور جب اس رنج میں راحت کے سوا
حشر میں تابِ جہنم سے مفر اور کہاں — اہلِ عصیاں کو ترے سایۂ رحمت کے سوا
نورِ عرفاں کی عبث ہے دلِ زاہد کو تلاش — اور یاں خاک نہیں خواہشِ جنت کے سوا
اِس کی بات اور ہے پائیں جو ہم اسمیں بھی مزا — آپ نے تو نہ دیا کچھ بھی اذیت کے سوا
اہلِ ظاہر نہ کریں کوچۂ باطن کی تلاش — کچھ نہ پائیں گے وہاں رنج و مصیبت کے سوا

علم و حکمت کا جنھیں شوق ہو آئیں نہ ادھر کچھ نہیں فلسفۂ عشق میں حیرت کے سوا

سب سے منھ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم اس میں اک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا

عقل حیران ہے اے جانِ جہاں راز ترا

کون سمجھے دلِ دیوانۂ حسرت کے سوا

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے وہ کیوں نہ خوبیٔ قسمت پہ اپنی ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا غافل ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت

اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا

عشقِ روزافزوں پہ اپنے مجھکو حیرانی نہ تھی جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا

دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی جب کہ تیرا حسن سرگرمِ خودآرائی نہ تھا

کیا ہوئے وہ دل کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی

اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

حفیظ جالندھری

۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء

حفیظ جالندھری

تو ہی بھروسا تو ہی سہارا

پروردگارا پروردگارا

منظور منظور — اے اہل دنیا

اللہ میرا — باقی تمہارا

یوں میں نے جیتی الفت کی بازی

اک بار کھیلا سو بار ہارا

یہ ناخدا ہے اے اہل کشتی

شاید کسی وقت کر دے کنارا

عشق و وفا میں ضد ہو گئی تھی

وہ بھی نہ ہارے میں بھی نہ ہارا

حفیظ جالندھری

۱۷ نومبر ۶۲

حفیظ جالندھری

سرگزشت

محمد حفیظ نام، حفیظ تخلص، سنِ ولادت ۱۹۰۰ء، مقامِ پیدائش جالندھر
والد کا نام حافظ شمس الدّین اور دادا کا حاجی مہرُ الدّین ہے۔ اِن کے اُستاد
ابو الاثر حفیظ کہہ کر پکارا کرتے تھے، اِس لیے یہی نام مشہور ہوگیا۔ بعض ریاستوں
نے "حسان الملک" اور گورنمنٹ نے "خاں صاحب" کے خطاب سے سرفراز
کیا ہے۔

تقریبًا دو سو برس پیشتر ایک ہندو راجپوت خاندان مسلمان ہوگیا تھا
اور نقلِ وطن کرکے پنجاب میں آبسا تھا۔ مُسلمان ہونے کے بعد اِس
خاندان کے اہم آدمی احمد شاہِ ابدالی کے مُجاہدوں کے ساتھ مرہٹوں سے
جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ حفیظ اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔

سکھوں کے وقت میں اِن کے خاندان پر خاصی تباہی آئی۔ انگریزوں
کے پنجاب پر قابض ہونے کے بعد اِن کے دادا حاجی مہرالدین نے مع اپنے
بھائیوں کے فوج کے لیے بارود تیار کرنے کا کام شروع کیا۔ یہی کام اِن
کے والد حافظ شمس الدین بھی کرتے رہے۔ حافظ صاحب کو خدا نے

بہت سی اولادیں عطا کی تھیں۔ مگر حفیظ کے جوان ہوتے ہوتے پانچ بھائی اور چھ بہنوئی تھوڑے عرصے میں سپردِ خاک ہوگئے۔ حفیظ کو اپنے اہل و عیال کی کفالت کے لیے متعدد پیشے، اور تجارتیں کرنا پڑی ہیں اور انقلاباتِ زمانے کے ہاتھوں بہت سے تلخ اور خلافِ ضمیر تجربات حاصل ہوئے ہیں۔

جنابِ حفیظ درمیانی قد، گندمی رنگ اور کتابی چہرے کے مسکین طبع، اور کم گو انسان ہیں؛ باتوں میں سادگی ہے اور بیجا تکلف و تصنع سے دور رہتے ہیں۔ آواز میں لحنِ داؤدی کے برکات شامل ہیں، جس سے حُسنِ کلام دوآتشہ ہوجاتا ہے۔

ابتداءً مسجد میں کلامِ مجید اور فارسی میں گلستاں، بوستاں تک پڑھی، بعد ازاں مدرسے میں ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔

بچپن ہی سے طبیعت کا میلان شعرگوئی کی طرف تھا، اِس لیے مطالعہ کے ساتھ شعرگوئی بھی جاری رہی۔ اسی درمیان میں بقدرِ ضرورت انگریزی بھی پڑھ لی۔

ابتدائی کلام ملک الشعرا مولانا غلام قادر گیلانی کو دکھایا۔ آپ کے بعد نہ کسی سے اصلاح لی، نہ مشورۂ سخن کیا۔

اِن کا خیال ہے کہ شاعری میں نفسیاتی پہلو اہم ہے۔ یعنی وہ شاعری بہتر ہے جو اِنسان کو مادّی اشیاء اور سفلی سطح سے بلند کرکے خود شناسی اور خدا ترسی کی طرف لے جائے۔

اِن کی رائے ہے کہ ادبِ اُردو کی خدمت اِس نہج سے ہونا اولیٰ ہے کہ سوقیانہ مذاق باقی نہ رہے اور بلند خیالات روز مرّہ کی زندگی

میں داخل ہوجائیں۔ نیز ایسے شاعروں کی قدر کی جائے جن کا فن فرد و قوم دونوں میں عزتِ نفس اور باہمی روا داری کی تلقین کرے۔ وہ شعرا جو فحش مضامین نظم کرتے ہیں اور سفلی جذبات کو اُبھار کر داد لینا چاہتے ہیں، اُن کی حوصلہ افزائی اچھے اور زندگی بخش ادب کو قتل کرنا ہے۔ کتابیں شائع کرنے والے ادارے اور انجمنیں اور کتابوں پر تنقید و تبصرہ کرنے والے حضرات مہیّا کیے جائیں، تو اُردو ترقی پا سکے گی۔

اِن کا خیال ہے کہ ہندی و سنسکرت ہی نہیں بلکہ عربی و فارسی کے الفاظ کی بھرمار بھی اُردو کو نقصان پہنچائے گی۔ البتہ جو الفاظ پہلے سے گھُل مِل کر جُزوِ زبان ہوگئے ہیں، اُن کا اِستعمال زبان کا حُسن ہے۔

ردیف و قافیہ کی پابندی اِن کے نزدیک بے معنی چیز ہے۔ شاعر کو اختیار ہے کہ موضوع کے لیے ضرورت سمجھے، تو قافیہ سے امداد لے، ورنہ حائل دیکھ کر ٹھکرا دے۔ چنانچہ یہ خود مردّف و مقفّٰی اور بے قافیہ و ردیف دونوں قسم کے اشعار کہتے ہیں۔

دوسرے شعرا کے چند اشعار جو ان کو پسند ہیں، حسبِ ذیل ہیں۔

میر درد
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے

میر
اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اِس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

ارشاد
تمنّاؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

غالب
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

صفی — غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

اقبال — گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

متقدمین میں میرؔ کو اور متوسطین میں غالبؔ، مومنؔ اور آتشؔ کو اُستاد مانتے ہیں۔ معاصرین میں مولانا سہاؔ کو درجۂ اُستادی دیتے ہیں، اور اقبالؔ کو درجۂ شاعر سے بلند سمجھتے ہیں۔ اِن کا قول ہے کہ معاصرین میں پورا شاعر میری نظر سے اوجھل ہے۔

تصانیف میں نظموں اور گیتوں کے دو مجموعے "نغمۂ راز" اور "سوز و ساز" طبع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ "تلخابۂ شیریں" زیرِ طبع ہے۔ ایک مثنوی موسوم بہ "شاہنامۂ اسلام" تین جلدوں میں چھپ کر شہرتِ تام حاصل کر چکی ہے۔ اِس میں سات ہزار اشعار ہیں۔ کچھ نظمیں "تصویرِ کشمیر" وغیرہ الگ الگ کتابی شکل میں بھی نکل چکی ہیں۔

بچوں کے لیے "بہار کے پھول" "پھول مالا" "ہندوستان ہمارا" "حفیظ کے گیت" اور دیگر نظمیں چار حصوں میں طبع ہو چکی ہیں۔

اِس وقت دہلی میں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں۔

انتخابِ کلام

مرے مذاقِ سخن کو سخن کی تاب نہیں
سخن ہے نالۂ دل نالۂ رباب نہیں

اگر وہ فتنہ کوئی فتنۂ شباب نہیں
تو حشر میرے لیے وجہِ اضطراب نہیں

نہیں ثواب کی پابند بندگی میری
یہ اک نشہ ہے جو آلودۂ شراب نہیں

مجھے ذلیل نہ کر عذرِ لن ترانی سے
یہ اہلِ ذوق کی توہین ہے جواب نہیں

جو کامیابِ محبت ہے سامنے آئے
میں کامیاب نہیں ہاں میں کامیاب نہیں

اُسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ
وہ بے حجاب سہی میں تو بے حجاب نہیں

سُنا ہے میں نے بھی ذکرِ بہشت و حور و قصور
خدا کا شکر ہے نیت مری خراب نہیں

سخنورانِ وطن سب ہیں اہلِ فضل و کمال
تو کیوں کہوں کہ میں ذرہ ہوں آفتاب نہیں

بیانِ درد کو دل چاہیے جنابِ حفیظ
فقط زبان یہاں قابلِ خطاب نہیں

اب وہ نوید ہی نہیں صوتِ ہزار کیا کرے
نخلِ امید ہی نہیں ابرِ بہار کیا کرے

دن ہو تو مہر جلوہ گر شب ہو تو انجم و قمر
پردے ہی جب ہوں پردہ در روئے نگار کیا کرے

عشق نہ ہو تو دل لگی موت نہ ہو تو خودکشی
یہ نہ کرے تو آدمی آخرِ کار کیا کرے

موت نے کس امید پر سونپ دیے ہیں بحر و بر
مشتِ غبار ہے بشر مشتِ غبار کیا کرے

شمع بھی ہو رہین یاس، پھول بھی ہوں اِدھر اُدھر
کوئی نہیں ہے آس پاس، کنجِ مزار کیا کرے

گریۂ شرم واہ واہ فردِ عمل ہوئی تباہ
دیکھیے اِک ہی گناہ روزِ حساب کیا کرے

اپنے کیے پہ بار بار کون ہو روز شرمسار
مِل گئے عذر پائدار قول و قرار کیا کرے

اہلِ نظر بھی ہیں بہت خیر نظر نہ آئیے
یہ تو مگر بتائیے عاشقِ زار کیا کرے

حدِ ہنر نہیں حفیظ تیرے خیال میں کوئی
اہلِ کمال میں کوئی تجھ کو شمار کیا کرے

دل ابھی تک جوان ہے پیارے — کس مصیبت میں جان ہے پیارے
رات کم ہے نہ چھیڑ ہجر کی بات — یہ بڑی داستان ہے پیارے
جنگ چھڑ جائے ہم اگر کہہ دیں — یہ ہماری زبان ہے پیارے
تلخ کر دی ہے زندگی جس نے — کتنی میٹھی زبان ہے پیارے
جانے کیا کہہ دیا تھا روزِ ازل — آج تک امتحان ہے پیارے
ہم ہیں بندے، مگر فقط تیرے — یہ ہماری ہی شان ہے پیارے
کب کیا میں نے عشق کا دعوے — تیرا اپنا گمان ہے پیارے

میں تجھے بے وفا نہیں کہتا
دشمنوں کا بیان ہے پیارے

تیرے کوچے میں ہے سکوں ورنہ
ہر زمیں آسمان ہے پیارے

ساری دنیا کو ہے غلط فہمی
مجھ پہ تو مہربان ہے پیارے

بزم ہے، احتراز ہی کیا ہے
پردہ سا درمیان ہے پیارے

عرضِ مطلب سمجھ کے ہو نہ خفا
یہ تو اِک داستان ہے پیارے

راوی میں کشتی

بن گیا ہے آسماں نتھرے ہوئے پانی کی جھیل
یا کسی ساحر نے ساکن کر دیا دریائے نیل

کوئی لہر اُٹھتی نہیں اِس بحرِ حیرت جوش میں
بزمِ انجم غرق ہے موسیقیٔ خاموش میں

کِس قدر یہ نیلگوں وسعت سکوں انگیز ہے
جس کے اندر چاند کا چہرہ تجلی ریز ہے

رات کے افسون میں گم ہو گئی ہے کائنات
یہ گماں ہوتا ہے شاید سو گئی ہے کائنات

شہ درے کے "نوحہ خواں" مینار بھی خاموش ہیں
مقبرہ بھی، باغ بھی، اشجار بھی خاموش ہیں

اِس طرف سایے کو لپٹائے ہے پُل سویا ہوا
چاندنی پر ریت کا ہے جزو کل سویا ہوا
اُس طرف اُجڑی ہوئی بارہ دری خاموش ہے
اِک گئے گزرے پُرانے خواب میں مدہوش ہے
اوڑھ کر مغموم بیوہ کی طرح چادر سفید
کروٹیں لیتی ہے راوی ناشکیب و نا امید
سینہ جنباں ہے کہ دل میں ہلکا ہلکا درد ہے
اور ہوا کیا ہے، لبِ راوی پہ آہِ سرد ہے
نغمہ سویا بربطِ آبِ رواں کی گود میں
جس طرح اِک طفل سو جاتا ہو ماں کی گود میں
چاند بالائے فلک ہے چاند زیرِ آب ہے
چاند بھی ساکن ہے لیکن چاندنی بیتاب ہے
چاند کو گھیرے میں لے کر بہ رہی ہے چاندنی
کوئی خواب آور کہانی کہہ رہی ہو چاندنی
اور اِس چاندی کے دھارے پر بہا جاتا ہوں میں
خواب کے عالم میں سب کچھ دیکھتا جاتا ہوں میں
یہ مری کشتی بھی گویا خواب کا آغوش ہے
میں کسی عالم میں بیٹھا ہوں بس اتنا ہوش ہے

دو طرف خاموش اور تاریک ساحل ہیں رواں
اس روانی پر روانی کا نہیں ہوتا گماں

چھپکے چھپکے دوسری جانب چلے جاتے ہیں یہ
میری کشتی کے جلو میں کیوں چلے آتے ہیں یہ

میں کہاں جاتا ہوں شاید یہ نہیں معلوم انھیں
آنکھ سے فطرت نے رکھا ہے مگر محروم انھیں

دور افق پر اک نیا منظر ہے میرے سامنے
زندگانی کا رخِ انور ہے میرے سامنے

میں وہاں جاتا ہوں نیندیں ٹوٹ جاتی ہیں جہاں
حسرتیں امید کے جلوے دکھاتی ہیں جہاں

میرے خیال و خواب کی دنیا لیے ہوئے
پھر آگیا کوئی رُخ زیبا لیے ہوئے

پھر دل میں آبسی ہے کسی انجمن کی یاد
اُجڑے ہوئے بہشت کا نقشا لیے ہوئے

یہ کم نگاہیاں ہیں تو پھر کس امید پر
بیٹھا رہوں فریبِ تمنا لیے ہوئے

دل گیسوے بتاں میں اُلجھ کر نہ گر پڑے
اُٹھا تو ہے خدا کا سہارا لیے ہوئے

اُس فتنۂ شباب کا عالم نہ پوچھیے
اک حشر اُٹھ رہا ہے تماشا لیے ہوئے

حسرت برس رہی ہے رُخِ نامراد پر
یہ کون جا رہا ہے تمنا لیے ہوئے

آئی ہے بے حیا مرا ایمان لوٹنے
دُنیا کھڑی ہے دولتِ دنیا لیے ہوئے

گو آج تک کسی سے توقع نہ تھی حفیظ
پھرتا ہوں اک جہان کا شکوا لیے ہوئے

جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ کام دیوتا فتنہ ہائے نو جگا
بجھ گیا ہے دل مرا پھر کوئی لگن لگا
سرد ہوگئی ہے آگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

پڑ گئی دلوں میں پھوٹ کیا بجوگ پڑ گیا
پرتھوی پہ چار کھونٹ ایک سوگ پڑ گیا
سرنگوں ہے شیش ناگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

تو نے آنکھ بند کی کائنات سو گئی
حسنِ خود پسند کی دن سے رات ہو گئی
زرد پڑ گیا سُہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

اب نہ وہ سفر نہ سیر — رہبری نہ رہ زنی
کچھ نہیں ترے بغیر — دوستی نہ دشمنی
اب لگاؤ ہے نہ لاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

اے مغنیٔ شباب — جاگ خوابِ ناز سے
دل شکستہ ہے رباب — عرصۂ دراز سے
مر گئے قدیم راگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

تو جو چشم وا کرے — ہر امنگ جاگ اُٹھے
آہ و نالہ جاگ اُٹھے — راگ و رنگ جاگ اُٹھے
جوگ سے ملے سہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

پھر اُسی اُٹھان سے — تیر اُٹھے کمان سے
صبر کی زبان سے — شورِ الاماں اُٹھے
جاگ اُٹھیں دلوں کے بھاگ — جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ اے نظر فروز　　جاگ اے نظر نواز
جاگ اے زمانہ سوز　　جاگ اے زمانہ ساز

جاگ نیند کے تیاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

یہ مال پرانا ہے

چاند اور ستاروں کا یہ سماں کیا دلکش اور سہانا ہے
افسوس مجھے نیند آئی ہے، افسوس مجھے اب جانا ہے
اک روز مجھے اس کوچے میں، ناصح کو لے جانا ہے
کچھ دل کو راہ پہ لانا ہے، کچھ دلبر کو سمجھانا ہے
معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں، کب کھلنا کب مرجھانا ہے
دل شیشہ بنے پیمانہ بنے ہم دل کی حقیقت جانتے ہیں
بے رنگ سا اک قطرہ ہے جسے آنسو بن کر بہ جانا ہے
بازار نیا گاہک بھی نئے اب جنسِ وفا کی قدر نہیں
بے سود نمائش رہنے دے اے دل یہ مال پرانا ہے
اے طائرِ جاں کچھ روز ابھی اڑنے کی ہوس میں رہتا ہے
اس تنگ قفس میں رہنا ہے، دکھ سہنا ہے، غم کھانا ہے

اگر کوئی بے نقاب کر دے

وہ سرخوشی دے، کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے، مرے لہو کو شراب کر دے

حقیقتیں آشکار کر دے، صداقتیں بے حجاب کر دے
ہر ایک ذرّہ یہ کہہ رہا ہے، کہ آ مجھے آفتاب کر دے

یہ خوب کیا ہے، یہ زشت کیا ہے، جہاں کی اصلِ سرشت کیا ہے
بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

کہو تو رازِ حیات کہہ دوں، حقیقتِ کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں کہ پتھروں کے جگر کو بھی آب آب کر دے

خلافِ تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری خطائیں شمار کر لے، مری سزا کا حساب کر دے

حفیظ سب سے بڑی خرابی ہے عشق میں لطفِ کامیابی
کسی کی دنیا تباہ کر دے، کسی کی عقبیٰ خراب کر دے

رضا لکھنوی
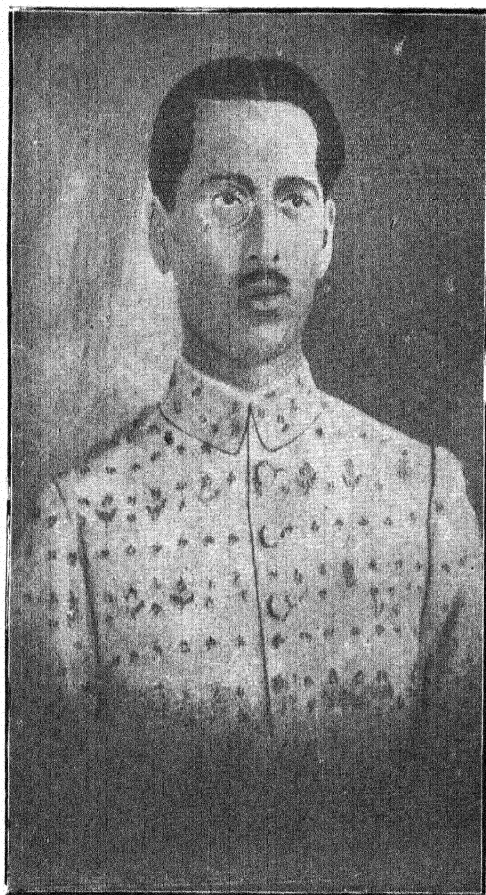
۲۳- مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

رضا لکھنوی

مثالِ حسن میں یوں زندگی تمام ہوئی

حسین صبح ہوئی اور حسین شام ہوئی

دیارِ عشق! بس اب سر جھکا دیں قدموں پر

اُدھر سے تیرے ہے سنّت سلام ہوئی

ہر ایک اپنی جگہ خوش، ہر اک یہی سمجھا

نگاہِ خاص بطرزِ نگاہِ عام ہوئی

بس اتنا تم نے محبت کا لے لیا بدلہ

سماعت کرنا، جو تکلیفِ انتقام ہوئی

ہے دیکھنے ہی کا، وقفہ جسے سمجھتے ہیں

رضا، وہ دھوپ چڑھی دن ڈھلا نہ شام ہوئی

[illegible]

رضا لکھنوی

سرگزشت

سیّد آل رضا نام، رضاؔ تخلص، والد کا نام (خان بہادر) سیّد محمد رضا، سالِ ولادت ۱۸۹۶ء اور مقامِ پیدایش قصبۂ نیوتنی اناؤ ہے۔ رضاؔ جب پیدا ہوئے، اِن کے والد عہدۂ منصفی پر مامور تھے۔ اِس کے بعد اودھ کے اضلاع میں انصاف و قانون کے مختلف عہدہ ہائے جلیلہ پر مامور رہے۔ آخر میں چیف کورٹ لکھنؤ کے جج ہو گئے تھے۔

عہدِ طفلی والد کے ساتھ مختلف اضلاع میں گزرا، لیکن زیادہ تر تعلیم سیتا پور میں ہوئی اور یہیں سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۹۱۶ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی، اے، کیا، اس کے بعد خانگی امور اور دیگر مصروفیتوں کے سبب سے دو سال بیکار گزرے۔ ۱۹۱۸ء میں قانون پڑھنا شروع کیا، ۱۹۲۰ء میں الہ آباد سے اِل، اِل، بی کا امتحان پاس کرکے لکھنؤ میں وکالت شروع کردی۔ تھوڑے عرصے کے بعد لکھنؤ سے پرتاب گڑھ جاکر وکالت کرنے لگے۔ وہیں خان بہادر نواب احمد حسین صاحب او، بی، ای، رئیس وتعلقدار، پریانواں ضلع پرتاپ گڑھ،

کی دختر سے شادی ہوگئی۔

جنابِ رضاؔ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور ورد وظائف کے عادی لکھنوی وضع کے خوش پوش، خوبصورت، خوب سیرت، خندہ پیشانی، خوش رنگ اور موزوں اندام انسان ہیں۔

اِن کی شاعری کا آغاز پرتاب گڑھ سے ہوتا ہے۔ ابتدا میں خاص انہماک نہ تھا، کبھی کبھی کچھ شعر کہ لیا کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں احباب کے اصرار پر باقاعدہ غزل کہنا شروع کی اور سیّد انوار حسین آرزوؔ لکھنوی سے بذریعۂ خط و کتابت تلمذ حاصل کیا۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ استاد سے ملنے کا کبھی موقع نہ ملا۔

شاعرانہ حیثیت سے پرتاب گڑھ ہی میں شہرت ہوچکی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں پرتاب گڑھ سے لکھنؤ آئے، تو یہاں بھی شعر و شاعری کی مجلس گرم تھی۔ انھوں نے بھی ان محفلوں میں حصہ لینا شروع کیا، اور تھوڑے عرصے میں اپنے ادبی رُتبے کو منوالیا۔ چنانچہ اس کے اعتراف میں انجمنِ معین الادب نے، جس کے ممبر جنابِ صفیؔ اور حضرتِ ظریفؔ بھی تھے، اِن کو نائب صدر کی حیثیت سے انتخاب کیا اور بعد ازاں صدارت کے فرائض تفویض کردیے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ انجمن "بہارِ ادب" کے نام سے موسوم ہوئی، تو اس میں سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔

فرماتے ہیں کہ "میں زیادہ تر جذباتی شاعری کرتا ہوں، جس میں روحانیت کا خاصا حصّہ ہوتا ہے۔ لیکن شاعری کی دُنیا کو یہیں تک محدود نہیں سمجھتا۔"

اُردو ہندی کے الفاظ کے بارے میں اِن کا خیال ہے کہ
"زبان ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتی۔ شاعر کو اپنے خیالات زمانہ کی
زبان کے لحاظ سے عام فہم طریقے پر ظاہر کرنا چاہیے۔ لیکن نوعیتِ
مضمون کے لحاظ سے کبھی اس کلیے سے الگ بھی ہٹنا پڑتا ہے۔ اُردو
زبان میں بکثرت ہندی الفاظ رائج ہیں۔ ایسے الفاظ کا سلیقے سے
استعمال اچھی صورتیں پیدا کرسکتا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں صرف
معنویت کا لحاظ کرنا نہیں پڑتا، بلکہ آواز، وزن، اور مزاج کی ہم آہنگی
بھی لازمی ہے۔"

ترویجِ اُردو کے بارے میں اِن کا خیال ہے کہ ضروریاتِ زندگی
اور لوازماتِ ترقی پر نظم و نثر شائع کرکے عوام تک اس طرح پہنچانا
چاہیے کہ اُنھیں کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ مطبوعات کی
خریداری اور اہم سے اہم فائدہ کا حصول ممکن ہو۔

ردیف و قافیہ کے متعلق خیال ہے کہ اکثر غیر مردّف اشعار بھی
کافی لطف دیتے ہیں، لیکن قافیہ اور ردیف دونوں سے معرا اشعار
بہت پھیکے ہوتے ہیں۔

رضاؔ کو غالبؔ اور میرؔ کا کلام بہت زیادہ پسند اور یاد ہے۔
نظم میں نظیرؔ اکبر آبادی اور انیسؔ کو، اور غزل میں غالبؔ،
داغؔ، مومنؔ، اور آرزوؔ کو اُستاد مانتے ہیں۔

ایک مجموعۂ کلام "نوائے رضاؔ" کے نام سے طبع ہوچکا ہے۔

انتخابِ کلام

اللہ، نظر کوئی ٹھکانا نہیں آتا
آنے کو چلے آتے ہیں جانا نہیں آتا

کہدوں تو مزے پر یہ فسانا نہیں آتا
ٹھہروں تو پلٹ کر یہ زمانا نہیں آتا

یہ تیرا کرم ہے کہ کھچے جاتے ہیں جلوے
مجھ کو تو نظر تک بھی اُٹھانا نہیں آتا

بے سمجھے وہی ہوش ہیں دیتے ہو ٹھوکے
جاؤ تمھیں دیوانہ بنانا نہیں آتا

میں شیشہ و ساغر کو تکوں جبکہ یہ سمجھوں
ساقی تجھے چلّو سے پلانا نہیں آتا

یوں روز ہوا کرتے تھے بیساختہ جگّر
اب آج بُلایا ہے تو جانا نہیں آتا

تدبیر سی تدبیر دُعاؤں سی دعائیں
سب آتا ہے تقدیر بنانا نہیں آتا

مقدور تھا بس ایک ہی سجدہ ترے در پہ
سر میں نے جھکایا ہے اُٹھانا نہیں آتا

آتی ہے رضا مجھ کو محبت کی غلامی
احسان محبت کا جتانا نہیں آتا

خیال حُسن میں یوں زندگی تمام ہوئی
حسین صبح ہوئی اور حسین شام ہوئی

وقارِ عشق بس اب سر جھکا دے قدموں پر
اُدھر سے تیرے لیے سبقتِ سلام ہوئی

ہر ایک اپنی جگہ خوش، ہر اک یہی سمجھا
نگاہ خاص بطرزِ نگاہِ عام ہوئی

نظر ملی تو تبسم رہا خموشی پر
نظر پھری تو ذرا ہمّتِ کلام ہوئی

بس اب تو تم نے محبت کا لے لیا بدلہ
معاف کرنا جو تکلیفِ انتقام ہوئی

ہے دیکھنے ہی کا وقفہ جسے سمجھتے ہیں
رضا وہ دھوپ چڑھی دن ڈھلا وہ شام ہوئی

اپنا لیا اُسے چمنِ روزگار نے
میرے لیے یہ پھول کھلایا بہار نے

ہر دم نئی ادا سے وہ آتے نظر پڑے
آنکھوں سے کتنے کام لیے انتظار نے

رچ رچ کے کیسے کیسے کھلاتی تھی روز پھول
جانے لگی تو مڑ کے نہ دیکھا بہار نے

واسطہ کوئی نہ رکھ کر بھی ستم ڈھاتے ہو تم
دل تڑپ اٹھتا ہے اب کا ہے کو یاد آتے ہو تم

میری سب آزادیاں بندہ نوازی پر نثار
اے خوشا قیدِ وفا زنجیر پہناتے ہو تم

لاتے ہو کیفِ طرب دیتے ہو پیغامِ حیات
کیا بتاؤں ساتھ کیا لیکر چلے جاتے ہو تم

اس طرح چھپتے ہو جلووں کی فراوانی کیسا تھا
میں سمجھتا ہوں کہ جیسے سامنے آتے ہو تم

سُن کے میرا حال ہیں آئیں آنکھیں نہ ملنے کے وجہ
یہ بھی ہو سکتا ہے شاید اشک بھر لاتے ہو تم

بھیجکر خوشبو ہواؤں میں باندازِ پیام
کیا یہ سچ ہے آج یوں میری طرف آتے ہو تم

دلگذاری بھی لیے ہے امتیازِ حسن و عشق
خون رو دیتا ہوں میں اور اشک پی جاتے ہو تم

چاند میں رنگت تمھاری پھول بھی تم سے بسے
کھنچتی ہیں دل فضائیں یاد آ جاتے ہو تم

تم سے ہے آراستہ جذبات کا تازہ چمن
جیسی رُت ہوتی ہے لیا پھول بنجاتے ہو تم

ذکر اس کا ہے رضاؔ نے کیں وفائیں یا نہیں
تم نے آخر کیا کیا کا ہے کو شرماتے ہو تم

دل کا ٹکڑا کوئی ہر لفظ میں شامل ہو جائے
ذکر جس کا ہے ذرا اُس کے بھی قابل ہو جائے

انتظار اور جدائی کا مسلسل یہ پیام
جان بھی جاتی ہوئی رات میں شامل ہو جائے

کون کہتا ہے جفاؤں پہ جفائیں نہ کرو
چاہتا ہوں کہ طبیعت متحمل ہو جائے

آپ کے ہار میں یہ پھول جو ہے دل کے قریب
اِس سے کہیے کہ جب اُترے تو مرا دل ہو جائے

حسن کی فطرت میں دل آزاریاں
اُس پہ ظالم نت نئی تیاریاں

سادگی میں آ گئیں دلداریاں
پھول اُٹھیں اک پھول میں پھلواریاں

متصل طفلی سے آغازِ شباب
خواب کے آغوش میں بیداریاں

چارہ سازوں کی وہ قاتل غفلتیں
دردمندوں کی وہ غیرت داریاں

بس ہجومِ شوق اب اِس بھیڑ میں
کھوئی جاتی ہیں مری خودداریاں

سوچ کر اُن کی گلی میں جائے کون
بے ارادہ ہوتی ہیں تیاریاں

اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے
چھوڑ دیجے بھی اب غریب آزاریاں

سہل کرنے آئے تھے مشکل مری
یا بڑھاتے جاتے ہو دشواریاں

دردِ دل اور جان لیوا پرسشیں
ایک بیماری کی سو بیماریاں

اور دیوانے کو دیوانہ بناد
اللہ اللہ اتنی خاطر داریاں

کھینچ دیتی ہیں خطِ موجِ شراب
مدبھری آنکھوں میں رنگیں دھاریاں

عشق اور ضد میں یہ رسم و راہ کی
ہائے دُنیا اُف رے دُنیاداریاں

بندھ رہا ہے اے رضاؔ رختِ سفر
ہو رہی ہیں کوچ کی تیاریاں

آنکھوں میں چھلک جائیں کہ دیوانہ بنائیں
کیا ہوں وہ تمنّائیں جو دل میں نہ سمائیں

اللہ رے آغازِ محبت کی فضائیں
باتوں میں، نگاہوں میں، خیالوں میں ادائیں

کیا وعدۂ مبہم پہ رضاؔ آس لگائیں
آج آئیں کہ کل آئیں، وہ آئیں کہ نہ آئیں

پھیرے مری تقدیر میں ہیں اُن کی گلی کے
یہ حُسنِ قبول اُن کا بلائیں نہ بلائیں

رہنے دیں یہی آس کہ بُجھ جائیں گے آنسو
دل توڑنے والے ابھی دامن نہ چھڑائیں

وہ آنسو جو ہنس ہنس کے ہم نے پیے ہیں
تمہارے دیے تھے تمہارے لیے ہیں

کریں وہ جو چاہیں، کہیں وہ جو چاہیں
میں پابندِ الفت مرے لب سیے ہیں

تمہارے ہی رحم و کرم کے سہارے
نہ معلوم مر مر کے کیوں کر جیے ہیں

بڑی دیر تک جس سے پونچھے تھے آنسو
وہ دامن ابھی ہاتھ ہی میں لیے ہیں

اِسے میں ہی سمجھوں، اسے میں ہی جانوں
ستم کر رہے ہیں، کرم بھی کیے ہیں

کہاں پائے نازک کہاں راہِ الفت
مرے ساتھ دو اِک قدم ہو لیے ہیں

ہنساتا ہے سب کو ہمارا فسانہ
ہمیں کہتے کہتے کبھی رو لیے ہیں

گل و باغ و نغمہ، مہ و مہر و انجم
جو تم ہو مرے، سب یہ میرے لیے ہیں

اُٹھاتے وہ کیوں مل کے بارِ محبت
یہ کیا کم ہے تھوڑا سہارا دیے ہیں

بھلے ہیں، بُرے ہیں، کسی سے غرض کیا
رضاؔ وہ بہر حال میرے لیے ہیں

جو خود نہ اپنے ارادے سے بدگماں ہوتا
قدم اُٹھاتے ہی منزل پہ کارواں ہوتا

فریب دے کے تغافل، وبالِ جاں ہوتا
جو اک لطیف تبسم نہ درمیاں ہوتا

دماغ عرش پہ ہے، تیرے در کی ٹھوکر سے
نصیب ہوتا جو سجدہ تو میں کہاں ہوتا

قفس سے دیکھ کے گلشن، ٹپک پڑے آنسو
جہاں نظر ہے، یہاں کاش آشیاں ہوتا

ہمیں نے اُن کی طرف سے منا لیا دل کو
وہ کرتے عذر، تو یہ اور بھی گراں ہوتا

سمجھ تو یہ کہ نہ سمجھے خود اپنا رنگِ جنوں
مزاج یہ کہ زمانہ مزاج داں ہوتا

بھری بہار کے دن ہیں خیال آ ہی گیا
اُجڑ نہ جاتا، تو پھولوں میں آشیاں ہوتا

حسین قدموں سے لپٹی ہوئی کشش تھی جہاں
وہیں تھا دل بھی رضا اور دل کہاں ہوتا

روشؔ صدیقی

۱۳- اپریل سنہ ۱۹۸۱ء

روش صدیقی

اے عالمِ تغافلِ پنہاں کچھ اور ہے
ہر لمحہ اضطراب کا عنواں کچھ اور ہے

ہے یوں تو ہر نشاط تبسمِ عاشقاں
لیکن اشارۂ غمِ جاناں کچھ اور ہے

یہ داستاں بھی رخِ دلگیر پہ منحصر
افسانۂ بہار کا عنواں کچھ اور ہے

ہر چند جامِ مرگ بھی ہے راحت آفریں
اے دردِ زندگی ترا درماں کچھ اور ہے

الطافِ برملا کی تو کیا بات ہے، مگر
رعنائیِ نوازشِ پنہاں کچھ اور ہے

بیتابیِ خرد ہے نہ بیباکیِ جنوں
اے دوست! رازِ چاکِ گریباں کچھ اور ہے

زاہد! ترا یقینِ ایماں بھی ہے بلند
لیکن مرا تصورِ ایماں کچھ اور ہے

برحق مسرتِ سروساماں، مگر دلش
لطفِ حیاتِ بے سروساماں کچھ اور ہے

☆

مصطفیٰ آباد رامپور
۱۵ ربیع الاول ۱۳۷۱ھ

روش صدیقی

روشؔ صدّیقی

سرگزشت

شاہد عزیز نام، روشؔ تخلص، اور ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء تاریخ پیدائش ہے۔ والد کا نام مولوی طفیل احمد شاؔہد، اور مولد و مسکن جوالا پور (سہارنپور) ہے، جو مناظرِ فطرت کے لحاظ سے بہت دلچسپ اور خود اِن کے بقول "قدیم ہندوستانی تہذیب کا گہوارہ ہے"

قرآنِ مجید اور اُردو فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ سنسکرت، ہندی اور انگریزی سے خود واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ سات سال کی عمر سے شعر کہتے ہیں اور اس فن میں اپنے والد سے تلمذ ہے۔ ۱۹۳۴ء تک برابر غزلیں لکھیں۔ اِس کے بعد نظم نگاری شروع کر دی ہے۔

روؔش پستہ قد، گندمی رنگ، کتابی چہرے اور خوبصورت آنکھوں کے ہنس مکھ نوجوان ہیں، اور خلوص و محبت اور صدق و صفا کی تصویر نظر آتے ہیں۔

اِن کو دیگر اساتذہ کے یہ چند اشعار پسند ہیں:-

غاؔلب

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالب

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو وہ لہو کیا ہے

"

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اِک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

انتخابِ کلام

چشمۂ شاہی۔ سری نگر کشمیر

کس نے جھانکا ہے شفق رنگ جھروکے سے مجھے
صبح کے چاکِ گریباں کو خبر ہو شاید
زندگی فرشِ قدم بن کے بچھی جاتی ہے
آگہی حسرتِ دیدار ہوئی جاتی ہے
کیوں یہ پیشانیٔ احساس جھکی جاتی ہے
حیرتِ عالمِ امکاں کو خبر ہو شاید
کس کے آنچل کی جھلک تھی یہ کوئی راز نہیں
کیا یہ روپوشیٔ انداز ہی غماز نہیں
شوق کو پردۂ غفلت نہ بنا اے محبوب
اس رہ و رسمِ قدامت کو اٹھا اے محبوب
نہ محبّت کو محبّت سے چھپا اے محبوب
عشق مدہوش سہی غافلِ آغاز نہیں
کچھ خبر ہے تجھے اے محوِ حجاب آرائی
اب کہاں ہے مری آوارگی و رسوائی
ہر طرح اب دلِ محرومِ سکوں ہے رسوا
ہر خموشی سے جدائی کا فسوں ہے رسوا

عشق حیراں ہے خرد چُپ ہے جُنوں ہے رسوا
زندگی ہے کہ کوئی قافلۂ تنہائی

تھک کے بیٹھا ہوں سرِ راہ گزر تیرے لیے
بن گیا گردِ رُخِ شام و سحر تیرے لیے
میں ترا خواب ہوں آنکھوں میں بسا لے مجھکو
میں ترا درد ہوں سینے سے لگا لے مجھکو
میں ترا عکس ہوں دامن میں چھپا لے مجھکو
میں تو صدیوں سے ہوں سرگرمِ سفر تیرے لیے

آرزو کیا غم و حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں
درد کیا تلخ اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک مایوسیٔ پیہم ہے عناں گیرِ وفا
خود بخود ٹوٹ نہ جائے کہیں زنجیرِ وفا
دور جاتے ہوئے کچھ خواب ہیں تعبیرِ وفا
جیسے کونین میں فرقت کے سوا کچھ بھی نہیں

شعلۂ زیست ہی محرومِ تپش میرے لیے
مرگ و ہستی میں نہیں کوئی کشش میرے لیے
شہد کی طرح بہت زہر پیا ہے میں نے
غمِ پنہاں کو بہت پیار کیا ہے، میں نے
داغ دامن پہ نہیں دل پہ لیا ہے میں نے

جیسے دنیا میں تھی ہر ایک خلش میرے لیے

انقلابات سے ہمدوش رہا ہوں برسوں
خالقِ تمکنتِ ہوش رہا ہوں برسوں
سی دیا ہے کبھی انجم کے گریبانوں کو
کبھی چھیڑا ہے گرجتے ہوئے طوفانوں کو
کر دیا خواب کبھی دہر کے افسانوں کو
خرد افروز و جنوں کوش رہا ہوں برسوں

کر دیا چاک نقابِ رُخِ آلام کبھی
صبحِ امکاں کو کیا منتظرِ شام کبھی
مگر احساسِ جدائی کو جدا کر نہ سکا
وقت کو دامِ تعیّن سے رہا کر نہ سکا
دہر پھر بھی مجھے بیزارِ وفا کر نہ سکا
تجھے بھولا نہیں میرا دلِ ناکام کبھی

یہ مری روح ہے یا حسرتِ نظارہ ہے
دل مرا اک ابدی شوق کا گہوارہ ہے
کہیں ہو جائے نہ پامالِ طلب عشق مرا
بھول جائے نہ کہیں راہِ ادب عشق مرا
خود فراموش ہوا جاتا ہے اب عشق مرا
ہر نفس تشنہ و وارفتہ و آوارہ ہے

کیا تری آنکھ بھی میرے لیے بے خواب نہیں
نرگسِ ناز میں بھی شبنم شاداب نہیں

کیا وہی عالمِ فردائے وفا ہے اب بھی
کیا وہی انجمنِ ہجر نما ہے اب بھی
کششِ دل کششِ دل سے خفا ہے اب بھی
تو بھی کیا اپنی روش کے لیے بیتاب نہیں

ختم یہ کشمکشِ وہم و گماں کب ہوگی
دور یہ ظلمتِ شبہائے خزاں کب ہوگی

کیا کوئی دورِ حجابات ابھی باقی ہے
کوئی امکانِ محالات ابھی باقی ہے
کیا جدائی کی کوئی رات ابھی باقی ہے
زندگی کی ابدی صبح عیاں کب ہوگی

آ! کہ اب شمعِ جدائی کو بجھا دیں اے دوست
یہ جو اک پردۂ آخر ہے اٹھا دیں اے دوست

کھو نہ جائیں کہیں طغیانِ فراموشی میں
غم کہیں ڈھونڈ نہ لے وادیٔ خاموشی میں
پھینک دیں روح کو فردوسِ ہم آغوشی میں
زندگی کو ابدی خواب بنا دیں اے دوست

بیداریِ مشرق

انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب
وقت آیا ہے کہ اُٹھے روئے گیتی سے نقاب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

اے جمالِ شمعِ آزادی کے پروانو، اُٹھو
سو چکے اے قصرِ ملت کے نگہبانو، اُٹھو
بادۂ بیداریٔ مشرق کے مستانو، اُٹھو
اب جگا بھی دو بہت کچھ سو چکا ہے آفتاب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

زندگی تابندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ
زندگی پایندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ
زندگی ہی زندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ
زندہ رہنا ہے تو آزادی سے کب تک اجتناب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

نوجوانو، اب نشاطِ کنجِ تنہائی کہاں
اے شجاعو، تم کہاں یہ فکرِ پسپائی کہاں
پھونک دو محفل کو وقتِ محفل آرائی کہاں

توڑ ڈالو ساغر و پیمانہ و چنگ و رباب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

زیست کی قیمت ہی کیا ہے پیشِ مردانِ وفا
کوئی پوچھے کربلا سے رازِ پیمانِ وفا
ہاں دکھا دو، اے شجاعو، جوشِ ارمانِ وفا
بے حدود و بے کنار و بے شمار و بے حساب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

اب بھی آنکھوں میں تمہاری رنگِ غفلت دیدہ ہے
خوابِ مستقبل کی ہر تعبیر ناپوشیدہ ہے
انتظارِ صبح کیسا صبح خود خوابیدہ ہے
تم ہی خود بڑھ کر اُلٹ دو مہرِ زرّیں کا نقاب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

سُرخیٔ خونِ وفا سے زندگی لبریز ہے
غیرتِ فرہاد برقِ خرمنِ پرویز ہے
جس کا تیشہ آج شعلہ بار و آتش خیز ہے
ہاں وہی ہے کامران و کامگار و کامیاب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

دردِ ملت کے لیے ملت کے غمخوار و چلو
اے شجاعو، اے دلیرو، اے رضاکارو چلو

منتظر ہے رحمتِ یزداں ہو فنا دارو چلو
یوں ہی کھل جاتے ہیں اکثر قصرِ آزادی کے باب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

برق ہو آنکھوں میں، دل میں آتشِ پروانہ ہو
خامشی میں جرأتِ بیدار کا افسانہ ہو
نوجوانو! اب تو ہر انداز بے باکانہ ہو
زندگی کب تک اسیرِ اعتکاف و احتساب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

شرم آئے اپنی ناکامی پہ استبداد کو
اب نہ صیّادی کی جرأت ہو کسی صیّاد کو
تیز کر دو شعلہ ہائے فطرتِ آزاد کو
بجلیوں سے چھین لاؤ اشتعال و اضطراب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

آسمانِ سرفروشی کے ستاروں کی قسم
تم کو ناموسِ وطن کے جاں نثاروں کی قسم
پاکبازوں کی قسم، شب زندہ داروں کی قسم
جاگ اٹھو دیکھو گے کب تک یونہی امیدوں کے خواب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

ہے بہت اونچا وطن پر مرنے والوں کا مقام

جاں نثارانِ وطن ہیں وارثِ دارالسّلام
یہ وہ منزل ہے کہ جس میں نا امیدی ہے حرام
ہو نہیں سکتا کبھی عزمِ وفا ناکامیاب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

ہوشیار اے غافلانِ حالِ بربادِ وطن
ڈھونڈتی پھرتی ہے تم کو روحِ ناشادِ وطن
گر ہوا اب بھی نہ تم کو پاسِ فریادِ وطن
ایشیا کا ذرّہ ذرّہ تم سے مانگے گا جواب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

شاہدِ معصوم

بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا
محفل آرائے وفا تو، اور میں ننگِ وفا
دل مرا تاریک ہے تو بحرِ انوار و ضیا
پست ہے منزل مری اور تو ہے رفعت آشنا
نور تیری ابتدا ہے خاک میری انتہا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

میرے آنسو تیرے زرّیں ہار کے قابل نہیں
میرے داغِ دل ترے گلزار کے قابل نہیں

میری الفت آہ تیرے پیار کے قابل نہیں

یعنی میں تیری محبت کے لیے ہوں ناسزا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

جلوہ گاہِ زندگی تیرے لیے حیراں رہے
عظمتِ کونین تیرے نام پر قرباں رہے
اور تو اک بے نوا کی یاد میں نالاں رہے
کچھ نہیں کھلتا محبت نے تجھے کیا کر دیا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

تو نگارِ عفت و عصمت ہے آوارہ ہوں میں
تو مقیمِ جلوہ گاہِ راز اور رسوا ہوں میں
آہ کب تیری محبت کے لیے زیبا ہوں میں
کچھ تو اپنے عشق کی معصومیوں پر رحم کھا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

ایک ساعت کے لیے حاصل مجھے راحت نہیں
میرے سازِ زندگی میں نغمۂ عشرت نہیں
آہ میں ناشاد ہرگز قابلِ الفت نہیں
ایک ننگِ زندگی کا غم کرے تیری بلا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

میری الفت میں نہ اپنی زندگی ناشاد کر

میرے غم میں یوں نہ اپنی ہر خوشی برباد کر
میں تو اک خوابِ پریشاں ہوں نہ مجکو یاد کر

چھوڑ دے میرے لیے یہ رات بھر کا جاگنا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

فطرتِ رنگیں کو تو اے دلربا محبوب ہو
قدسیوں کو تیرا اندازِ حیا محبوب ہو
آہ! ہر محبوب کو تیری ادا محبوب ہو

اور تیرے دل کو ہو محبوب اک غم آشنا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

ڈر رہا ہوں تیرا رازِ عشق افشا ہو نہ جائے
محرمِ اسرارِ خاموشی یہ دنیا ہو نہ جائے
ضبطِ غم ہمرنگِ افسونِ تمنّا ہو نہ جائے

آہ! کیا ہوگا اگر یہ رازِ پنہاں کھل گیا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

گر کسی سے تیرا ذکرِ عشق سن پاؤں گا میں
منہ چھپا کر بزمِ ہستی سے نکل جاؤں گا میں
آہ! پھر تجھ کو نہ دنیا میں نظر آؤں گا میں

گر تجھے مجھ سے محبت ہے تو دے مجکو بھلا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

ساحر دہلوی

۲۳- مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

عیاں ہو رہے ہیں اور تقل پر گل میں نہاں بھی ہو
جہان جان ہو اک گل بہر جان جہاں بھی ہو

بہار دیر و حرم میں ہو وہاں میخانہ میں ساغر
برہمن ہو خیابان شیخ ہو پیر مغاں بھی ہو

از راقم سید احمد دہلوی
۲۵ مئی سنہ ۱۹۱۱

ساحر دہلوی

سرگزشت

امرناتھ نام، اور ساحر تخلص ہے۔ رائے بریلی میں ۲۹ مارچ ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ مسکن دہلی ہے۔

اِن کے والد پنڈت جانکی پرشاد بیجان، بریلی فوج میں خزانچی اور میر منشی تھے۔ ۱۸۷۲ء میں مستعفی ہو کر دلّی چلے آئے، اور ۱۸۷۲ء سے ۱۸۹۲ء تک محکمۂ ریلوے میں ملازم رہے۔ اِنھیں حُسنِ خدمات کے صلے میں پورے مشاہرے کی پنشن اور رائے بہادر کا خطاب عطا ہوا تھا۔

ساحر ۱۲ سال کے سِن میں پنڈت پرشاد رام رازداں کے شاگرد ہوئے، اور تین چار سال اُن سے اُردو فارسی کی تعلیم پائی۔ ذوقِ شعر و سخن اوائلِ عمر سے تھا اور حافظۂ خداداد کی بدولت اُردو فارسی کے ہزارہا اشعار یاد کرلیے تھے۔ سب سے پہلے فارسی میں اشعار کہے، اور زانوے شاگردی عبدالحلیم عاصم کی خدمت میں تہ کیا۔

قدرتِ زبان کے ساتھ فکرِ موزوں اور ذہانتِ طبع حاصل تھی،

صفی، میرزا، مہر، اور آغا صوفی کے مشاعروں میں شریک ہوکر دادِ سخن حاصل کی۔

۲۲ سال کی عمر میں بسلسلۂ ملازمت اجمیر شریف جانا پڑا۔ وہاں دوستوں کے اصرار سے ریختہ کی طرف توجہ کی۔ کچھ عرصے کے بعد دلّی واپس آکر جواہر ناتھ ساقی اور رام رچھپال شیدا کی صحبتوں میں شریک ہونے لگے۔ پھر عرصۂ دراز تک عہدۂ تحصیلداری پر ممتاز رہے، مگر شغلِ سخن جاری رکھا۔ اب بصلۂ حسنِ خدمات اپنے وطن دلّی میں پنشن پا رہے ہیں۔

جنابِ ساحر، تہذیبِ قدیم کے حامل اور دلّی کے وضع دار اصحاب میں سے ہیں، اِن کی باتوں سے وسعتِ اخلاق، تواضع، نرمی اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے؛ چنانچہ اِن کا یہ شعر خود اِنھیں کی حالت کا مرقع ہے:

کوئی حرم سے، دیر سے منسوب ہر کوئی
اِک رہ گیا ہوں میں کہ تمھارا کہیں جسے

سادہ وضع قطع ہے۔ چھریرا جسم، متوسط قدوقامت اور کتابی چہرہ ہے۔ داڑھی، مونچھ، وغیرہ کے بال باقتضایٔ سِن سفید ہوچکے ہیں۔ لیکن بایں سِن و سال شعر و شاعری کی مجالس میں وہی گرما گرمی ہے۔ ہر ماہ کے آخری ہفتے میں معمولی مشاعرہ اور سال بسال ماہِ دسمبر کے آخر (یوم کلاں) میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کرتے ہیں، جس میں قریب و بعید کے احبابِ باذوق اور سخن گو حضرات جمع ہوتے ہیں۔

ساحر روحانی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "اردو

ادب میں شاعری سے ایک قسم کا لوچ اور بیان میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں خدمتِ ادب کے لیے وہ جملہ ذرائع اختیار کرنا اولیٰ ہے، جو اس کی ترقی میں معاون و مدد ہو سکتے ہیں، اور وہ بہت ہیں۔"

ہندی اور سنسکرت کے مروجہ الفاظ سے زیادہ کے شامل کرنے کے خلاف ہیں۔ صرف اُنھیں الفاظ کا استعمال جائز قرار دیتے ہیں، جو اُردو میں گھُل مِل گئے ہیں۔

اِن کے خیال میں ردیف و قافیہ کی پابندی لازمی کی جائے، اِس لیے کہ جب تک ردیف و قافیہ کلام میں نہ ہو، زور نہ ہوگا۔

دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار حسبِ ذیل ہیں:-

انشاؔ

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری، راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

غالبؔ

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوے

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

نظم و غزل دونوں میں، آزاد انصاری مرحوم کو بہتر سمجھتے ہیں۔

اِن کے کارنامے بصورتِ تراجم و تصانیف بہت ہیں، لیکن جس قدر مطبوعات معلوم ہو سکے، وہ حسبِ ذیل ہیں:-

کفرِ عشق، فسانۂ توحید، رسالۂ اسرارِ حقیقت، جلوۂ جہاں نما، رموزِ معرفت، رازِ مغفرت۔

حضرتِ ساحرؔ کا ۱۹۴۲ء میں انتقال ہوگیا۔

انتخابِ کلام

حسنِ ازل صفات میں جب جلوہ گر ہوا
آئینۂ جمالِ وجودِ بشر ہوا

ترکِ وجود سے جو فنا میں گزر ہوا
نورِ بقا تجلئ تارِ نظر ہوا

کونین ہے جو نورِ تجلّی کی بارگاہ
"کُن" سے فروغِ حسنِ ازل جلوہ گر ہوا

نیرنگِ حسن و عشق ہیں ذات و صفات کے
اک شاہدِ ازل مرا مدِّ نظر ہوا

اُس کی نظر میں ہستئ عالم ہی نورِ ذات
نیرنگئ صفات سے جو بے اثر ہوا

کیوں حسن پردہ دار کی ہیں لن ترانیاں
منصور رازِ عشق کا جب پردہ در ہوا

صورت نزول

ہے ذاتِ پاک نورِ علیٰ نورِ بے نشاں
وہم خودی تعینِ علمِ خبر ہوا

وہ عینِ علم نورِ تجلّی میں ہے علیم
جو عالمِ صفات میں جب جلوہ گر ہوا

معلوم و علم و عالم و عرفاں ہیں نورِ ذات
اشراق و ہوش و صوت میں رنگِ اثر ہوا

جو نورِ ذات مرکزِ عینِ صفات تھا
اپنی تجلیوں میں نہاں سر بسر ہوا

پنہاں شجر میں تخم ہوا تخم میں شجر
روشن ہے یہ مثال کہ دانہ شجر ہوا

قائم ازل سے دورِ مسلسل ہی تا ابد
ہنگامہ مرگ و زیست کا وہمِ نظر ہوا

جاں جسم ہو کے جلوۂ پندار بن گئی
جاں مبتدا ہوئی تو یہ جلوہ خبر ہوا

مرکز ہے نقطہ، نقطہ ہے خط، خط ہی دائرہ
ساحرؔ قدم حدوث میں حسنِ نظر ہوا

عشقِ صادق

رسولِ عشق ہی ترا شیدا کہیں جسے — عشاق میں مثال ہی رسوا کہیں جسے

مدِ نظر ہے نقشِ سویدا کہیں جسے — اک بیخودی ہے ذوقِ تماشا کہیں جسے

اہلِ نظر ہیں محوِ تماشائے روئے یار — ہی پردہ دار حسنِ خود آرا کہیں جسے

ہی منزلِ فنا میں مرا ہم سفر وہ داغ — روشن چراغِ گنبدِ مینا کہیں جسے

سینہ چمن ہی غنچۂ دل ہے شگفتہ گُل — تیری نگاہ ہے چمن آرا کہیں جسے

ہجراں نصیبِ دل کو ہی کیا غم کہ عشق میں — فرقت کی ایک رات ہی دُنیا کہیں جسے

دم کرتی ہی جو قالبِ خاکی میں روحِ علم — فیضِ نسیم ہے دمِ عیسیٰ کہیں جسے

پردہ ہے حسن و عشق میں وصل و حجاب کا — یوسف ہے بے نقاب زلیخا کہیں جسے

کوئی حرم سے دیر سے منسوب ہی کوئی — اک رہ گیا ہوں میں کہ تمھارا کہیں جسے

ساحرؔ نفس وہ دام ہے جس میں کہ ہے اسیر
موجِ رمِ خیال کہ عنقا کہیں جسے

آ حلقۂ رنداں میں مستِ مئے لا ہو جا — ہستی سے گزر ای دل اور دم میں فنا ہو جا

دے دادِ سبک روحی ای جان ہوا ہو جا — اس گلشنِ ہستی میں ہم رنگِ صبا ہو جا

پندارِ حسد اے دل ہی پایۂ خود بینی — ای پشت بہ منزل تو اب رو بہ قفا ہو جا

پیمانِ وفا تو نے کیوں روزِ ازل باندھا — مجبورِ قضا اے دل راضی برضا ہو جا

تھا حسنِ خود آرائی مدِ نظرِ شاہد — نقش اپنا مٹا اے دل اور محوِ فنا ہو جا

آنکھوں میں سما ناہی گر سرمہ صفت ساحرؔ — خاکِ درِ میخانہ بے بیم و رجا ہو جا

کیفِ مستی میں عجب جلوۂ یکتائی تھا توہی تو تھا نہ تماشا نہ تماشائی تھا
حُسن بے واسطۂ ذوقِ خود آرائی تھا عشق بے واہمۂ لذتِ رسوائی تھا
تیری ہستی میں نہ کثرت تھی نہ وحدت پیدا ہمہ و بے ہمہ و باہمہ یک جائی تھا
پردہ در کوئی نہ تھا اور نہ در پردہ کوئی غیرتِ عشق نہ تھی عالمِ تنہائی تھا
لافنا تیری صفت تھی تری ہستی کا ثبوت بے نشاں تیرا نشاں صورتِ بینائی تھا
حال تھا حال، نہ ماضی تھا نہ تھا مستقبل از ازل تا بہ ابد جلوۂ رعنائی تھا
ذات قائم تھی بذات اور صفت تھی معدوم "کُن" نہ تھا معرکۂ انجمن آرائی تھا
بزم میں تو نے جو اُلٹا رُخِ روشن سے نقاب ایک عالم ترے جلوے کا تماشائی تھا
فتنہ زا حُسن ہوا عشق ہوا شور فگن رم ہوا شوق فزا، شوقِ تماشائی تھا

حرف اور صوت میں آنا ہی کسی کا ہو کلام
ساحرؔ آغاز میں "کُن" غایتِ پیدائی تھا

دل مرشدِ زمانہ ہے، دل نورِ ذات ہے دل خضرِ راہِ چشمۂ آبِ حیات ہے
دل جلوہ و حجابِ حیات و ممات ہے دل رازدارِ عالمِ ذات و صفات ہے
دل پاسبانِ مملکتِ واردات ہے آئینہ دارِ حُسنِ رُخِ کائنات ہے
دل جلوہ گاہِ حُسن ہے عرفانِ ذات کا دل کُن فکاں میں پیکرِ حُسنِ صفات ہے
نقطہ ہے دل زمین و زماں کے وجود کا دل مرکزِ محیطِ مکان و جہات ہے
دل آفتابِ عالمِ اشراق و معرفت دل ماہتابِ تیرہ شبِ واہمات ہے
دل نفسِ ناطقہ ہے وجود و شہود کا دل مشتِ خاک میں دمِ آبِ حیات ہے
دل ہے کلیدِ قفلِ درِ گنجِ معرفت لوحِ طلسم بندیِ ذات و صفات ہے

اہلِ نگاہ، اہلِ یقیں، اہلِ علم کو — دل ظلمتِ دوکون میں وجہِ نجات ہے
دل کے بیاں سے ہے شکر افشاں زبانِ کلک
ساحرؔ، یہ حالِ دل ہے کہ قند و نبات ہے

قید و آزادی

حُسن اک آن ہے بے ساختہ پن میں رہ کر — عشق ہے ذوقِ فنا دل کی لگن میں رہ کر
گُل سے اُلفت ہے نہ ہے خار سے کاوش ہم کو — سروِ آزاد ہیں ہستی کے چمن میں رہ کر
کارواں عمر کا رہتا ہے سفر میں ہر دم — خوش ہے آہنگِ جرس یادِ وطن میں رہ کر
بزمِ ہستی ہے ترا جلوہ گہِ حُسن و جمال — میں نہیں تو ہے مری جاں مرے تن میں رہ کر
یوں رہا رنگِ تعلق سے سراپا آزاد — جسم سے جیسے جُدا جان ہو تن میں رہ کر
ساقیٔ بزمِ ازل، جام تھا کیا ہوش رُبا — ہوش تن کا نہ رہا پیکرِ تن میں رہ کر
گُل ترا رنگِ اثر ہے کہ مرا حُسنِ قبول — خارِ گلزار ہوا چشمِ چمن میں رہ کر
حُسن وہ نورِ تجلّی ہے کہ بے نور ہوئی — چشمِ خور کالبدِ چرخِ کہن میں رہ کر
عشق وہ مہرِ منور ہے کہ ہے کون و مکاں — ذرّہ وش چرخ زناں جس کی کرن میں رہ کر
ابتدا عشق سے تھی عشق میں انجام ہوا — کافرِ عشق ہوا دیرِ کہن میں رہ کر
ننگِ کونین ہوں خلعت ہے مرا عریانی — ننگِ ناموس بنوں گا نہ کفن میں رہ کر
وسعتِ دہر میں راحت نہ ملی جیتے جی — اب ہیں آرام سے آغوشِ کفن میں رہ کر
دیکھ تو خونِ تمنا ہے تبسم میں نہاں — شوخیٔ لعلِ لبِ عہد شکن میں رہ کر
وا ہوئے لب تو کُھلا رازِ طلسمِ صوت — گنجِ معنٰے ہے زباں قفلِ دہن میں رہ کر

حرف بے صوت ہی گویا ہے خموشی ساحر
سرمۂ تحریر بنا چشمِ سخن میں رہ کر

کثرتِ جلوۂ وحدت

نور سے خورشیدِ عرفاں کے جو نکلی اک شعاع
عقل و دل اول ہوئے اُس ضو سے اک روشن متاع

دل سے ضو پھیلی خلا میں باد میں اور نار میں
سامعہ اور لمس و بینش بن کے چمکی وہ شعاع

آب میں اور خاک میں ہے ذائقہ اور شامہ
ہیں مطیعِ ضو یہ ساتوں علم ہوا ان کا مطاع

ایک علمی ضو لطافت اور کثافت بن گئی
علم اور معلوم اور عالم ہے اوجِ ارتفاع

ہے حواسِ پنجگانہ کی اسی ضو سے نمود
عقل کے پردے سے دل میں آ گئی تھی جو شعاع

خاک و آب و آتش و باد و خلا میں اک نمود
ایک ضو کونین میں ہے جلوہ آرائے ابداع

ہو گیا عالم دوگانہ اک کبیر اور اک صغیر
فیض سے علمِ سگانہ کے ہوئی حاصل متاع

جس کا جیسا علم ہے اور جس کی جیسی ہے سرشت
اُس کو ویسا ہی نظر آتا ہے ساحرؔ الوداع
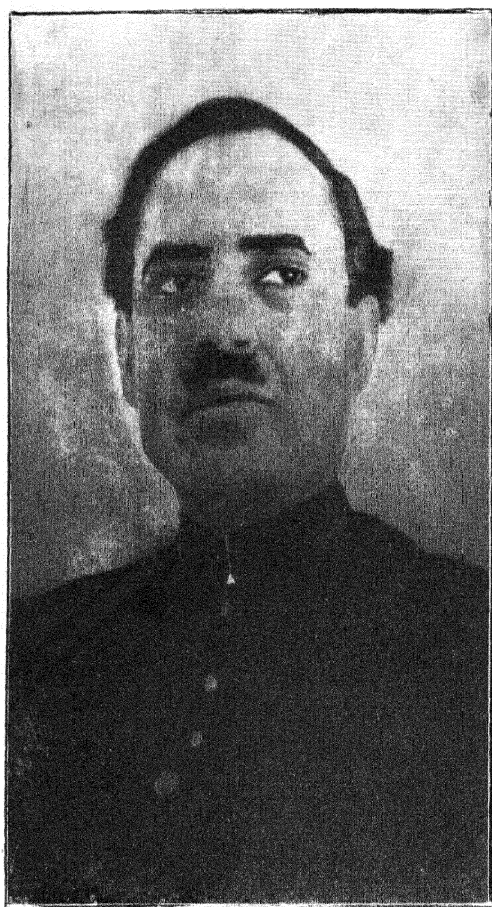
ساغر نظامی

۲۲ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

ساغر نظامی

ساغر نظامی

سرگزشت

محمد یار خاں نام، ساغر تخلص، تاریخِ ولادت ۲۱ر دسمبر ۱۹۰۵ء، مقامِ ولادت علی گڑھ بالائے قلعہ، قوم مہمند یوسف زئی افغان، اور والد کا نام احمد یار خاں ہے، جو ہنوز بقیدِ حیات ہیں۔

اِن کا خاندان تقریباً ۲۰۰ سال پیشتر کابل سے ہندوستان آیا۔ مورثِ اعلیٰ سردار شہبازؔ خاں، نواب جھجر کی فوج کے سپہ سالار تھے۔

ساغر کی عربی و فارسی کی تعلیم مکان پر ہوئی، اور انگریزی نویں کلاس تک گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ میں پڑھی۔

شاعری میں اُستادی و شاگردی کے قائل نہیں ہیں۔ اِن کا خیال ہے کہ شاعری کی تکمیل مشاہدۂ حیات، تجربات اور مطالعۂ فطرت سے تعلق رکھتی ہے۔

فرماتے ہیں کہ " ۹ برس کی عمر سے ذوقِ شعر پیدا ہوا اور تیرہ برس کی عمر میں مشاعروں میں شریک ہوا۔ گویا ابتدائی تعلیم کے دوش بدوش میری شاعری پیدا ہوئی۔ غیر شعوری طور پر میں ماحول اور

روایات میں اُلجھا ہوا تھا، اِس لیے میں نے شروع کا کلام مولانا سیماب اکبر آبادی کو دکھایا۔"

مزاج میں ظرافت اور شوخی ہے۔ مشاعروں میں کلام ترنّم سے پڑھتے ہیں۔

اُردو ادب کی ترویج و ترقی کے اِن کی نظر میں تین طریقے ہیں:-

(۱) ادب کو محدود حلقوں سے نکال کر عام اور بسیط کیا جائے۔

(۲) کوئی زبان اور اُس کا ادب اُس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا، جب تک ادیب و شاعر کی مساعی اور کارکردگیوں کی کوئی اقتصادی قدر و قیمت تسلیم نہ کرلی جائے۔

(۳) نشر و اشاعت کے ذرائع میں آسانی، یعنی موجودہ طریقہ طباعت کو ترک کرکے ٹائپ کو اختیار کیا جائے۔

غزل میں میر، غالب، مومن، حسرت، جگر اور نظم میں نظیر اکبرآبادی، انیس، اقبال اور جوش کو اُستاد سمجھتے ہیں۔

یہ شعر کی ترقی کے مقابل ردیف و قافیہ کو ترجیح نہیں دیتے، البتہ بحر کا ہونا اِن کے نزدیک ضروری ہے۔

اِن کے دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار یہ ہیں:-

شادؔ عظیم آبادی

یہ بزمِ مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

میرؔ

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم تو سمجھے تھے کہ، اے میرؔ یہ آزار گیا

جگرؔ

گرچہ ثابت نہ ہوئی میری حقیقت اُسکو
لے لیا کام جو لینا تھا غمِ ہستی نے

ساغر اِس وقت میرٹھ میں رہتے ہیں اور رسالۂ ایشیا کے اڈیٹر ہیں۔
منظوم تصانیف حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) صبوحی - غزلوں کا مجموعہ -

(۲) شبابیات - رباعیات کا مجموعہ -

(۳) بادۂ مشرق - نظموں، غزلوں اور رباعیات کا مجموعہ -

انتخابِ کلام

ہجومِ خیالات ہے اور کیا ہے
وہی بارِ آفات ہے اور کیا ہے

وہی ہم ہیں اور آرزوے طلاطم
وہی شورِ جذبات ہے اور کیا ہے

کہاں ہم، کہاں تم، کہاں یہ ستارے
یہ دل کی کرامات ہے اور کیا ہے

فغانِ شبی، نغمۂ صبحگاہی
فریبِ مناجات ہے اور کیا ہے

جنونِ محبّت، جنونِ محبّت
فسونِ روایات ہے اور کیا ہے

مرے من کی دنیا، مرے من کی دنیا
جہانِ طلسمات ہے اور کیا ہے

ہے ساغر کو لٹنے کی خواہش ابھی تک
یہ سحرِ خرابات ہے اور کیا ہے

بلند از وفا و جفا ہو گئے ہم
محبت سے بھی ماورا ہو گئے ہم

اشاروں اشاروں میں کیا کہہ گئے وہ
نگاہوں نگاہوں میں کیا ہو گئے ہم

ترے دل میں رہ کر، نظر میں سما کر
تمنائے ارض و سما ہو گئے ہم

نہ دیکھے گئے اس نظر کے تقاضے
ز سر تا بہ پا مدعا ہو گئے ہم

حقیقت نہ تھی دل لگانے کے قابل
حقیقت سے کیوں آشنا ہو گئے ہم

تباہی بھی ہے اک نشانِ ہدایت
لُٹے اِس قدر، رہنما ہو گئے ہم

نہیں کم یہ ہستی کی معراج ساغر
کہ خاکسترِ مے کدا ہو گئے ہم

تو نہیں بہار کا راز داں تجھے کب وقوفِ بہار ہے
جسے کہہ رہا ہے شمیم تو وہ چمن کا گردِ غبار ہے

یہ خرام اُن کا چمن چمن، یہ شمیم اُن کا سمن سمن
یہ سکوت اُن کا یہ روِشِ روش کہ بہار محوِ بہار ہے

وہ ملاحتیں وہ صباحتیں، وہ لطافتیں، وہ نزاکتیں
وہ نظر میں جب سے سمائے ہیں، مجھے آنکھ اُٹھانا بھی بار ہے

وہ جدھر مچل کے گزر گئے ہیں، فضائیں غرقِ بہار ہیں
وہ جہاں جھجھک کے ٹھہر گئے ہیں، وہیں ہجومِ بہار ہے

تو ہے جانِ گل، تو میانِ گل، تو مکینِ گل، تو مکانِ گل
ترے دم قدم سے ہے گلستاں، ترے دم قدم سے بہار ہے

ہم تم

وہ دَور یاد ہے جب بیقرار تھے ہم تم
بہ کارِ دل ہمہ تن انتظار تھے ہم تم
وہ وقت یاد ہے جب نغمہ بار تھے ہم تم
وہ عہد یاد ہے جب کامگار تھے ہم تم
وفا نصیب، محبت شعار تھے ہم تم

قیودِ دوریِ منزل کو توڑ توڑ گئی
جنوں کی سوئی ہوئی رُوح کو جھنجھوڑ گئی

دلوں پہ نقشِ حیاتِ دوام چھوڑ گئی
جو پہلی بار ملی، اور دلوں کو جوڑ گئی
اُسی نگاہ کی اک یادگار تھے ہم تم

وہ وادیوں میں سفر اور وہ چاندنی راتیں
وہ گھاٹیوں میں شب و روز شوق کی باتیں
وہ آرزو کا مچلنا، وہ درد کی گھاتیں
بساطِ دل پہ مشیت کو ان گنت باتیں
فتوحِ عشق کے سرمایہ دار تھے ہم تم

کلی کلی سمنستاں کو ناز تھا جس پر
روش روش پہ گلستاں کو ناز تھا جس پہ
چمن کہاں کا بیاباں کو ناز تھا جس پر
جہاں میں روحِ بہاراں کو ناز تھا جس پر
نسیمِ گل کی قسم وہ بہار تھے ہم تم

جو میں تھا بلبلِ گلشن، تو تم گلِ رنگیں
جو میں تھا مہر، تو تم تھیں فروغِ ماہِ مبیں
ہمارے پاؤں پہ جھکتی تھی ساعتوں کی جبیں
جو میں تھا صبحِ منور، تو تم شبِ زریں
جہانِ عشق کے لیل و نہار تھے ہم تم

متاعِ طور کا معدن تھا عالمِ امکاں

جمال و نور کا مخزن تھا عالمِ امکاں
ہمارے عکس سے گلشن تھا عالمِ امکاں
ہمارے نور سے روشن تھا عالمِ امکاں
سپہرِ عشق کے برق و شرار تھے ہم تم

رُلا رُلا کے محبت میں دل کو روتا کون ؟
جہانِ زیست کو طوفان میں ڈبوتا کون ؟
اور آرزو کے کنول ارضِ دل میں بوتا کون ؟
جہانِ عشق کا پروردگار ہوتا کون ؟
جہانِ عشق کے پروردگار تھے ہم تم

ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی عاشقی بیعت
ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی ساحری بیعت
ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی زندگی بیعت
ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی شاعری بیعت
جہانِ شعر کا وہ شاہکار تھے ہم تم

شرارِ گل نے چمن کو کیا تھا خاکستر
صبا نے خاک اُلٹ دی تھی جام و ساغر پر
حسد سے شمع تھی محفل میں آتشِ بکسر
دلوں کا ذکر نہیں دل تو خاک تھے جل کر
کئی جگہ تو نگاہوں پہ خار تھے ہم تم

وہ حسن، عشق کی حکمت نے ہم کو بخشا تھا
وہ شوق، حسن کی فطرت نے ہم کو بخشا تھا
وہ ذوق، ساقیٔ قدرت نے ہم کو بخشا تھا
وہ ظرف، کیفِ محبت نے ہم کو بخشا تھا
کہ آنکھ بند تھی اور ہوشیار تھے ہم تم

سمن سمن تھا بلاوا، سحر سحر آغوش
چمن چمن تھی تمنا، شجر شجر آغوش
نفس نفس تھا تقاضا، نظر نظر آغوش
نہ تھا نشانِ زمان و مکاں، مگر آغوش
قدم قدم پہ کبھی ہم کنار تھے ہم تم

ہمارے دم سے ندا تھی ہماری دم سی ندیم
ہمارے دم سے صدا تھی ہمارے دم سے کلیم
ہمارے دم سے گھٹا تھی ہمارے دم سے شمیم
ہمارے دم سے سحر تھی ہمارے دم سے نسیم
کہ حاصلِ چمنِ روزگار تھے ہم تم

ہر ایک ذرّے سے کرتے تھے آسماں پیدا
ہر ایک نقطے سے کرتے تھے سو جہاں پیدا
ہر ایک چُپ سے ہماری تھے سو بیاں پیدا
ہر اک نگاہ سے کرتے تھے داستاں پیدا

قدم قدم پہ فسانہ نگار تھے ہم تم

وفا کے نقش پہ قرباں تھی لالہ کاری بھی
وفورِ کیف سے رقصاں تھی کامگاری بھی
مٹی ہوئی تھی تعلق سے دوست داری بھی
اثر سے وجد میں تھی روحِ جاں نثاری بھی

کچھ ایک دوسرے پہ یوں جاں نثار تھے ہم تم

تصورات پہ ہلکا سکون چھایا تھا
تغیرات پہ گہرا سکون چھایا تھا
یہ کائنات تھی سادہ سکون چھایا تھا
ہر ایک شے پہ کچھ ایسا سکون چھایا تھا

کہ جیسے سارے جہاں کا قرار تھے ہم تم

قیامتیں تھیں بپا چرخ کی سیاست میں
ہمارے نام تھے سرنامۂ بغاوت میں
کھٹک رہے تھے بہت دن سے چشمِ فطرت میں
ہماری ذات تھی اِک نیر قلبِ قدرت میں

ازل سے چشمِ مشیت میں خار تھے ہم تم

ہر ایک پردہ تھا مضراب سازِ الفت کا
کمال دیکھیے اِک نغمۂ محبت کا
طلسم ٹوٹ گیا تھا حریم قدرت کا

گلا سا بیٹھ گیا تھا نفیرِ فطرت کا
چمن میں جھوم کے یوں نغمہ بار تھے ہم تم
وہ بھید ہے کہ کوئی اُس کو پا نہیں سکتا
وہ نغمہ ہے کہ کوئی اُس کو گا نہیں سکتا
میں دیکھ سکتا ہوں، پردہ اُٹھا نہیں سکتا
میں سوچتا ہوں مگر لب پہ لا نہیں سکتا
کہ کس جنونِ وفا کا شکار تھے ہم تم

سائل دہلوی
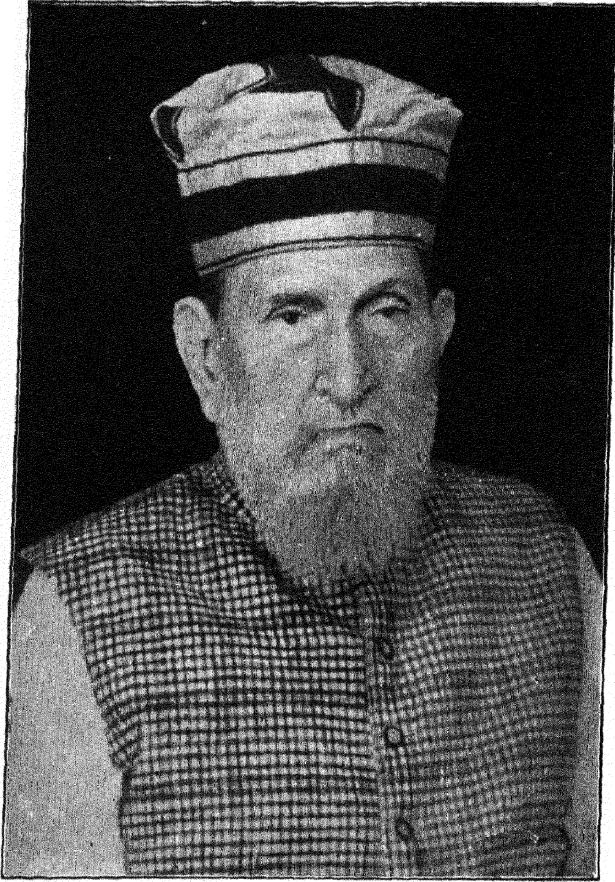
سائل دہلوی

سائل دہلوی

سرگزشت

سراج الدین احمد خاں نام، سائل تخلص، سنۂ ولادت ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء، مقامِ ولادت دہلی، اور والد کا نام نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب ابنِ ضیاء الدین احمد خاں جاگیر دار ریاستِ لوہارو ہے۔

چار سال کی عمر میں سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا، اور اپنے جدِّ بزرگوار کے آغوشِ شفقت میں پرورش پانے لگے۔

عربی و فارسی کی تعلیم مولوی قاسم علی سے اور فنّی کتابیں میرزا ارشد علی گورگانی سے پڑھیں اور اِنھیں کو ابتدائی کلام دکھایا۔

گورا رنگ، چوڑے چکلے اعضاء، اور خوبصورت ناک نقشہ ہے، وسیع الخیالی، متحمل مزاجی، عالی ہمتی، اور فراخ حوصلگی کا مجسّمہ اور دلّی میں شاہی عہد کا لباس استعمال کرنے والوں کی مبارک یادگار ہیں۔

پہلی شادی نواب ممتاز حسن خاں کی بہن سے ہوئی تھی۔ چند سال کے بعد اِن کا انتقال ہوگیا، تو دوسرا عقد ۲۴ سال کی عمر میں فصیح الملک نواب میرزا خاں داغ دہلوی کی دخترِ خواندہ سے ہوا۔

اِس نسبت سے ذوقِ شاعری نے بھی رنگ بدلا، اور معاملہ بندی و وارداتِ قلبی اِن کا میدان قرار پایا۔ اِنھوں نے تین سال کی مشق میں جنابِ داغ کے تلامذۂ ارشد میں جگہ پائی۔

شوقِ شعرگوئی کے علاوہ شہسواری اور پولو کا از حد شوق تھا اور بہترین "جاکی" شمار ہوتے تھے۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد دکن میں ٹُنگی میں پاؤں اُلجھا اور گر پڑے، جس سے کُولھا اُتر گیا۔ اِس کی تکلیف ہنوز باقی ہے، حتیٰ کہ بغیر سہارے کے اُٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور و مجبور ہیں۔

اب سلسلۂ شعر و شاعری منقطع ہوگیا ہے، حافظہ نسیان سے بدل رہا ہے، نورِ بصر رو بہ انحطاط ہے اور اعضا میں بھی ضعف پیدا ہوگیا ہے۔ شبانہ روز میں جو وقت کرب و بےچینی سے بچتا ہے، وہ یادِ خدا و فکرِ آخرت میں گزرتا ہے۔

اِن کے نزدیک "شاعری میں سب سے اہم پہلو زبان کا ہے اور ساتھ ہی اِس کے علوم و فنون کی ترجمانی۔"

یہ ہندی اور سنسکرت کے اُن الفاظ کے حامی ہیں، جن سے زبان میں ثقل و گرانی پیدا نہ ہو۔ اشعار میں ردیف و قافیہ کی پابندی اُسی طرح ضروری سمجھتے ہیں جس طرح گانے کے لیے مزامیر۔

دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار حسبِ ذیل ہیں:۔

میر — مسجد ایسی بھری بھری کب تھی، میکدہ اِک جہان ہے گویا

داغ — ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے
دِل کو تھاما اُن کا دامن تھام کے

داغؔ　　　　داغؔ کے سب حرف لکھتے ہیں جُدا
ٹکڑے کر ڈالے ہمارے نام کے

نواب معاصر دردؔ　　　　یہ پھرتی ہے بلبل چونچ میں گُل
شہیدِ ناز کی تربت کدھر ہے

غزل میں آرزوؔ لکھنوی، سیمابؔ اکبر آبادی، داغؔ، غالبؔ، اور میرؔ دردؔ کو، اور نظم میں نظیرؔ اکبر آبادی کو اُستاد مانتے ہیں۔

سائلؔ نے مضامین کی شگفتگی، الفاظ کی بندش، ترکیب کی چستی، محاورات کی دل کشی فصیح الملک سے ورثے میں پائی ہے، اور حضرتِ داغؔ کے ممتاز شاگرد جن خصوصیات کے حامل ہیں، اُن میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں

اِن کا طرزِ غزل خوانی نہایت دل کش اور پُردرد ہے۔ دن رات گھر پڑے پڑے دل گھبرا جاتا ہے، اِس لیے سہ پہر کو رکشا میں لیٹ کر اکثر جامع مسجد کے قریب رحیمیہ کتب خانے آجاتے ہیں، اور جب تک دل چاہتا ہے، رکشا میں لیٹے لیٹے سیر کرتے رہتے ہیں۔ اہلِ ذوق اور قدردانوں کا اکثر مجمع ہو جاتا ہے۔

خرابیٔ صحت کے باعث باوجودِ توقع بزمِ سخن رامپور کی کسی مجلس میں تشریف نہ لا سکے۔

انتخابِ کلام

ہمیں کہتی ہے دنیا زخمِ دل زخمِ جگر والے — ذرا تم بھی تو دیکھو ہم کو تم بھی ہو نظر والے

نظر آئیں گے نقشِ پا جہاں اُس فتنہ گر والے — چلیں گے سر کے بل رستہ وہاں کے رہگزر والے

ستم ایجادیوں کی شان میں بٹّا نہ آ جائے — نہ کرنا بھول کر تم جور چرخِ کینہ ور والے

جفا و جورِ گلچیں سے چمن ماتم کدہ سا ہے — پھڑکتے ہیں قفس کی طرح آزادی میں پر والے

الف سے تا بہ یا اللہ افسانہ سنا دیجے — جنابِ موسیٰ عمراں وہی حیرت نگر والے

ہمیں معلوم ہے ہم جانتے ہیں ہم نے دیکھا ہے — دل آزردہ ہوا کرتے ہیں از حد چشمِ تر والے

کٹانے کو گلا آٹھوں پہر موجود رہتے ہیں — وہ دل والے جگر والے سہی ہم بھی ہیں سر والے

تماشا دیکھ کر دنیا کا سائلؔ کو ہوئی حیرت
کہ تکتے رہ گئے بد گوہروں کا منھ گہر والے

زعم نہ کیجو شمع رو بزم کے سوز و ساز پر — رکھیو نظر بجائے ناز خاطرِ پیر ناز پر

زیب نہیں ہے شیخ یہ مے کشِ پاکباز پر — نہ مٹیں سو لگائی گا داغِ جبیں نیاز پر

کہتا ہوں ہر حسیں سے میں نیتِ عشق ہے مری — آئے گا میرا دل مگر شاہدِ دل نواز پر

فرق حیات و مرگ کا مرغِ چمن کے دل سے پوچھ — دیتا ہے فوق دام کو چنگلِ شاہباز پر

خوابِ لحد ہے پُر سکوں عہدِ حیات پُر الم — موت نہ کیوں ہو طعنہ زن زندگیٔ دراز پر

سنگِ درِ حبیب پر ہوتا ہوں سجدہ ریز میں — خلقِ خدا ہے معترض مجھ پہ مری نماز پر

منعمِ بے بصر یونہیں دیکھیے تا کجا رہے — محوِ نشاط و خوشدلی نغمۂ تارِ ساز پر

فخرِ عمل نہ چاہیے سعی عمل ضرور ہے — آنکھ رہے لگی ہوئی رحمتِ کارساز پر

در پہ بتوں کے دی صدا سائلِ بے نوانے یہ
فضلِ خدا رہے مدام حالِ گدا نواز پر

امانت محتسب کے گھر شرابِ ارغواں رکھدی
تو یہ سمجھو کہ بنیادِ خراباتِ مغاں رکھدی

کہوں کیا پیشِ زاہد کیوں شرابِ ارغواں رکھدی
مری توفیق جو کچھ تھی برائے میہماں رکھدی

یہانتک تو نبھایا میں نے ترکِ مے پرستی کو
کہ پینے کو اُٹھالی اور لیں انگڑائیاں رکھدی

جنابِ شیخ مے خانہ میں بیٹھے ہیں برہنہ سر
اب اُن سے کون پوچھے آپنے پگڑی کہاں رکھدی

تمھیں پروانہ ہو مجھ کو تو جنسِ دل کی پروا ہے
کہاں ڈھونڈوں کہاں پھینکی کہاں دیکھوں کہاں رکھدی

لگالیں گے اُسے اہلِ وفا بے شبہہ آنکھوں سے
اگر پائے عدو پر اُس نے خاکِ آستاں رکھدی

اِدھر پر نوچ کر ڈالا قفس میں اُف رے بیدردی
اُدھر اک جلتی چنگاری میانِ آشیاں رکھدی

ضمیر اُس کا ڈبو دے گا اُسے آبِ خجالت میں
وفاداری کی تہمت غیر پر کیوں بدگماں رکھدی

ہوس مستی کی سائل کو نہیں کافی ہے تھوڑی سی
پیالے میں اگر پس خوردۂ پیرِ مغاں رکھدی

حق و ناحق جلانا ہو کسی کو تو جلا دینا
کوئی روئے تمہارے سامنے تم مسکرا دینا

تردد برق ریزوں میں تمھیں کرنیکی کیا حاجت
تمھیں کافی ہے ہنستا دیکھ لینا مسکرا دینا

دلوں پر بجلیاں گرنیکی صورت گر کوئی پوچھے
تو میں کہدوں تمھارا دیکھ لینا مسکرا دینا

ہوئی بجلی سے کس دن نقلِ اندازِ ستمگاری
تمھاری طرح سیکھا لاکھ اُس نے مسکرا دینا

ستمگاری کی تعلیمیں اُنھیں دی ہیں یہ کہہ کہہ کر
کہ روتا جس کسی کو دیکھ لینا مسکرا دینا

تکلف برطرف کیوں پھول لیکر آؤ تربت پر
مگر جب فاتحہ کو ہاتھ اُٹھانا مسکرا دینا

نہ کیوں ہم انقلابِ دہر کو مانیں اگر دیکھیں
گلوں کا نالہ کرنا بلبلوں کا مسکرا دینا

نہ جانا ناتوانی پر کہ اب بھی سعیِ ناخن سے
دکھا سکتے ہیں ہم زخمِ کہن کا مسکرا دینا

تمھارے نام میں کیا زعفراں کی شاخ ہے سائل
کہ جو سنتا ہے اِس کو اُس کو سن کر مسکرا دینا

بسا اوقات آجاتے ہیں دامن سے گریباں میں
بہت دیکھے ہیں ایسے جوشِ اشکِ چشمِ گریاں میں

نہیں ہے تابِ ضبطِ غم کسی عاشق کے امکاں میں
دلِ خوں گشتہ یا دامن میں ہوگا یا گریباں میں

مبارک، بادیہ گردو، بہار آئی بیاباں میں
نمودِ رنگِ گل ہے ہر سرِ خارِ مغیلاں میں

زیادہ خوفِ رسوائی نہیں ہے سوزِ پنہاں میں
دھواں ہوتا ہے لیکن کم چراغِ زیرِ داماں میں

ہمیشہ پی کے مے جام و صراحی توڑ دیتا ہوں
نہ میرا دل ترستا ہے، نہ فرق آتا ہے ایماں میں

مزہ کیوں کاوشِ زخمِ جگر کا آج کم کم ہے
نمک کی کوئی چٹکی رہ گئی ہو گی نمکداں میں

جنابِ قیس نے دل سے بھلایا دونوں عالم کو
جنوں کے چار حرفوں کا سبق لیکر دبستاں میں

بہار آئی ملا یہ حکم مجھ کو اور بلبل کو
کہ وہ کاٹے قفس میں، خاک چھانوں میں بیاباں میں

ترنم ریزیاں بزمِ سخن میں سن کے سائل کی
گماں ہوتا ہے بلبل کے چہکنے کا گلستاں میں

اُڑا سکتا نہیں کوئی مرے اندازِ شیون کو
بمشکل کچھ سکھایا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

گریباں چاک کرنے کا سبب وحشی نے فرمایا
کہ اِس کے تار لے کر میں سیوں گا چاکِ دامن کو

بہار آتے ہی بٹتی ہیں یہ چیزیں قید خانوں میں
سلاسل ہاتھ کو پاؤں کو بیڑی طوق گردن کو

جھڑی ایسی لگادی ہے مرے اشکوں کی بارش نے
دبا رکھا ہے بھادوں کو بھلا رکھا ہے ساون کو

دلِ مرحوم کی میت اجازت دو تو رکھدیں ہم
ترے تلوے برابر ہی زمیں کافی ہے مدفن کو

اجازت دو تو ساری انجمن کے دل ہلادوں میں
سمجھ رکھا ہے تم نے ہیچ تاثیراتِ شیون کو

سلوکِ پیرمے خانہ کی اے ساقی تلافی کیا
بجز اس کے دعائیں دو اسے پھیلا کے دامن کو

خزاں کا جو گلشن سے پڑ جائے پالا | تو صحنِ چمن میں نہ گل ہو نہ لالا
لیا تیرے عاشق نے برسوں سنبھالا | بہت کر گیا مرنے والا کسالا
پئے فاتحہ ہاتھ اٹھا دے گا کوئی | سرِ تربتِ بے کساں آنے والا
اسی گریہ کے تار سے میری آنکھیں | بنادیں گی ندی بہادیں گی نالا
بٹھا کر تمھیں شمع کے پاس دیکھا | تم آنکھوں کی پتلی وہ گھر کا اجالا
خطِ شوق کو پڑھ کے قاصد سے بولے | یہ ہے کون دیوانہ خط لکھنے والا

ق

دیا حکم ساقی کو پیرِ مغاں نے | پئے محتسب جام و مینا اٹھالا
یہ سنتے ہی میخوار بولے خوشی سے | ہمیں سا ہے یہ نیک اللہ والا

حقیقت میں سائل نے ذوقِ ادب سے
جہاں تک اچھالا گیا نام اچھالا

ہوتے ہی جواں ہو گئے پابندِ حجاب اور
گھونگٹ کا اضافہ ہوا بالائے نقاب اور

جب میں نے کہا کم کرو آئینِ حجاب اور
فرمایا بڑھا دوں گا ابھی ایک نقاب اور

پینے کی شراب اور، جوانی کی شراب اور
ہشیار کے خواب اور ہیں، مدہوش کے خواب اور

گردن بھی جھکی رہتی ہے کرتے بھی نہیں بات
دستورِ حجاب اور ہیں، اندازِ حجاب اور

پانی میں شکر گھول کے پیتا تو ہے اے شیخ
خاطر سے ملا دے مری دو گھونٹ شراب اور

ساقی کے قدم لے کے کہے جاتا ہے یہ شیخ
تھوڑی سی شراب اور دے تھوڑی سی شراب اور

سائل نے سوال اس سے کیا جب بھی یہ دیکھا
ملتا نہیں گالی کے سوا کوئی جواب اور

جتاتے رہتے ہیں یہ حادثے زمانے کے
کہ تنکے جمع کریں پھر نہ آشیانے کے

سبب یہ ہوتے ہیں ہر صبح باغ جانے کے
سبق پڑھاتے ہیں کلیوں کو مسکرانے کے

ہزاروں عشقِ جنوں خیز کے بنے قصّے
ورق ہوئے جو پریشاں مرے فسانے کے

ہیں اعتبار سے کتنے گرے ہوئے دیکھا
اِسی زمانے میں قصّے اِسی زمانے کے

قرارِ جلوہ نمائی ہوا ہے فردا پر
یہ طول دیکھیے اک مختصر زمانے کے

نہ پھول مرغِ چمن اپنی خوشنوائی پر
جواب ہیں مرے نالے ترے ترانے کے

اُسی کی خاک سے ماتھے کی زیب بندہ نواز
جبیں پہ نقش پڑے ہیں جس آستانے کے

سیماب اکبرآبادی

۲۳- مارچ ۱۹۸۱ء
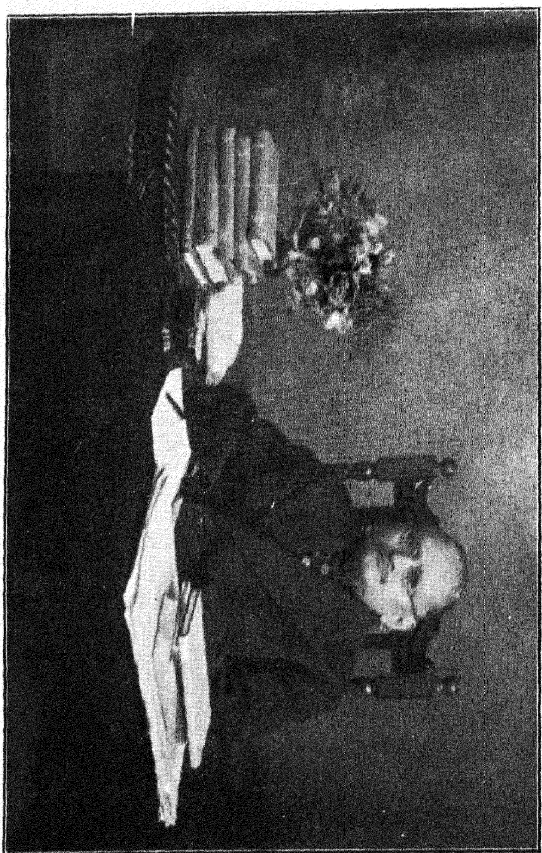
سیماب اکبر آبادی

سیماب اکبرآبادی

سرگزشت

عاشق حسین نام، اور سیماب تخلص ہے۔ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۹۹ ہجری مطابق سنہ ۱۸۸۲ء میں سنیچر کے دن صبح کے وقت اکبرآباد (آگرہ) کے محلہ ناتی منڈی گگو گلی املی والے مکان میں پیدا ہوئے۔

اِن کے والد مولوی محمد حسین، اجمیر شریف میں ٹائمس آف انڈیا پریس کی شاخ کے اعلیٰ افسر تھے۔ یہ دینیات کے دلدادہ، اور مذہب کے بڑے پابند تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ وعظ اور شعر گوئی کا بھی ذوق تھا۔ اپریل ۱۸۹۷ء میں بمقام آگرہ انتقال کیا۔

جنابِ سیماب فارسی و عربی کی کتبِ متداولہ کی تکمیل کے بعد انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے۔ ۱۷ سال کی عمر تھی۔ اور ایف، اے کا آخری امتحان دینے والے تھے کہ والد کے انتقال کے باعث سلسلۂ تعلیم جاری نہ رکھ سکے، اور کالج چھوڑنا پڑا۔ بیس سال کی عمر میں شادی ہوگئی۔ اِس وقت ایک لڑکی اور چار لڑکے بقیدِ حیات ہیں۔

ذوقِ شاعری فطری اور میراثِ پدری ہے۔ اِن کا دستور تھا کہ فارسی نصاب میں جس قدر اشعار پڑھتے، اُن کا اردو ترجمہ نظم کرکے اپنے

اساتذہ کے سامنے رکھ دیا کرتے۔ کالج کی زندگی میں مولوی سدیدالدین قریشی اور مولوی تحسین علی اجمیری وغیرہ نے ذوقِ شاعری کو اور اُبھار دیا اور یہ امتحان کے پرچوں میں بھی فارسی نظم کا اُردو نظم میں ترجمہ کرنے لگے۔

حضرتِ سیماب سفید رنگ، موزوں اندام، کشادہ پیشانی، سادہ مزاج، سنجیدہ خیال، بلند اخلاق، پُر خلوص اور محبت پیشہ ادیب و شاعر ہیں۔

عمرِ عزیز کا زیادہ تر حصّہ انگریزی دفاتر کی ملازمت میں گزرا۔ خود کہتے ہیں۔

فطرتاً عجزِ طبیعت بن گیا رنگِ حیات
عمر بھر سیماب پابندِ اطاعت ہی رہا

جس زمانے میں بسلسلۂ ملازمت کانپور میں مقیم تھے، لکھنؤ میں جلال لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا۔ لیکن اِن کی طبیعت فطرتاً "دبستانِ دہلی" کی طرف مائل تھی۔ ۱۸۹۸ء میں فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگرد ہو گئے، اور اصلاح کا سلسلہ فصیح الملک کی وفات سے کچھ پہلے تک برابر جاری رہا۔

کانپور کے دورانِ ملازمت میں نظر وارثی اور یہ ایک مکان میں رہا کرتے تھے، اُن کی تشویق سے اُنھیں کے ہمراہ دیوہ تشریف جاکر حضرت شاہ وارث علی صاحبؒ سے بیعت کی۔

تالیف و تصنیف کا عہدِ طفلی سے شوق تھا" فرماتے ہیں کہ "اس وقت تک ۲۸۴ کتابیں مختلف موضوعات پر میرے قلم کی رہینِ کشش ہیں

اِن میں سے چند منظوم تصانیف حسبِ ذیل ہیں:۔

کارِ امروز، کلیمِ عجم، نیستاں، پیامِ فردا، توراتِ مشرق، آیات الادب، سرودِ غم، پیغامات۔

بقولِ مؤلفِ خمخانۂ جاوید فنِ تاریخ گوئی میں یدِ طولیٰ حاصل ہے، تغزل میں متانت کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور طرزِ حالی و رنگِ اقبال کے درمیان ایک شاہراہ نکالنے میں کوشاں ہیں۔

جنابِ سیماب نے اپنے شاعرانہ معتقدات کے تحت حسبِ ذیل خیالات کا "کلیمِ عجم" میں اظہار کیا ہے۔

"۱۹۱۸ء سے میرا رنگِ تغزل بالکل بدل گیا۔ میں اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامل ہوں، میں شاعری میں فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اُس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اُس کے متعلقات ہوں، یا جو امرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حُسنِ محض اور عشقِ محض ہے، اور ضمائر کا مرجع وہ ذات ہے جو حاملِ حُسن ہو اور مرکزِ محبت ہو۔ جس طرح علم شاعری کے لیے لازمی اور ضروری ہے اِسی طرح محبت اور شاعری کو لازم و ملزوم سمجھتا ہوں، اور خیالات میں تصنع یا بناوٹ کا حامی نہیں۔

میں خیالات کو صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں اور حقیقی وارداتِ قلب کی ترجمانی میرا مسلکِ بیان ہے۔ گو مجھے تمام اصنافِ سخن پر فطرت نے قدرت دی ہے، مگر میں نظم و غزل اور رباعی کو اظہارِ خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعرا کی الہامی حیثیت پر میرا

ایمان ہے۔ میں شعر میں بلند خیالات کے ساتھ بلند الفاظ کا موید ہوں، ایسے الفاظ جن میں غرابت نہ ہو اور جنھیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ آسانی سمجھ سکیں۔

میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ شعرا غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔ اِس لیے کہ غزل جس چیز کا نام ہے وہ اپنی قدامت اور کہنگی کی وجہ سے اب زیادہ کارآمد نہیں۔ شعرائے متغزلین اِس صنف کو بہ تمام و کمال پامال اور ختم کر چکے ہیں۔ منتہی شعرا کے لیے بھی غزل میں اجتہاد و ایجاد کی گنجایش بہت کم باقی ہے۔ مگر نظم کا میدان ہنوز وسیع ہے اور یہ صنفِ سخن اُردو شاعری کو کارآمد اور مفید بنا سکتی ہے، اِس لیے زیادہ سے زیادہ توجہ اِسی کی طرف ہونی چاہیے۔

شعر و شاعری کے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ زندگی شعر ہے اور شعر زندگی ہے۔ کائنات بغیر "شاعر" کے ایک سازِ بے نغمہ ہے۔ شاعر دُنیا کا ایک ایسا جزو ہے جس کے بغیر دُنیا کا قیام ناممکن ہے۔ الہام و وحی کا وہ سلسلہ جو پیغمبروں کے مبعوث نہ ہونے سے ختم ہو چکا ہے، "شاعر" کے دماغ اور سروش میں اب بھی باقی ہے۔ اور ہمیشہ باقی رہے گا"۔

حضرتِ سیماب عرصہ ہوا ملازمت سے استعفا دے چکے ہیں اور ۱۹۲۹ء سے اکبر آباد میں رہتے ہیں اور اُردو ادب کی خدمت کرتے ہیں۔ شاگردوں کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ خود اِن کے بقول "شاید کسی کی نہ ہوئی"

انتخابِ کلام

تاجِ شاہی

محبت کی ٹھوکروں میں

۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کا ایک رومان

جسے دیوانگی کہتے ہیں الفت کی نبوت ہے
غنیمت ہے جو صدیوں میں کوئی دیوانہ ہو جائے

مرحبا اے وارثِ[1] اورنگِ مغرب مرحبا — تو نے روحِ ماضیِ مشرق کو زندہ کر دیا
صرف دلجوئی ادائے کجکلاہی تو نے کی — تو نے کی ہاں فی الحقیقت بادشاہی تو نے کی
تاجِ شاہی ہے اک انگڑائی ترے ایثار کی — قیصری ٹھوکر ہے تیرے جذبۂ خودار کی
جوگ اُلفت کا لیا تو نے بقیدِ سروری — مِل گئی فیضِ محبت سے تجھے پیغمبری
تو نے ثابت کر دیا دُنیا کی عظمت کچھ نہیں — دل کی دولت دل کی دولت ہے حکومت کچھ نہیں
رشک ہے جس پر سلاطیں کو وہ قسمت ہے تری — دل کی لامحدود دنیا پر حکومت ہے تری
صرف تقویمِ سیاست میں سلاطیں کا ہے نام — اور تاریخِ ادب میں مِل گیا تجھ کو مقام
تیری منزل منزلِ دارا و جم سے دور ہے — تو دیارِ عشق کا اک صاحبِ دستور ہے
تو کہ اِس مردود و مطلوقہ کو ہے چھوڑے ہوئے — منفعل دُنیا کھڑی ہے تجھ سے مُنھ موڑے ہوئے
دیکھ اے شہزادۂ درد آشنا و دل شناس — سب بشارت دے رہے ہیں تجھ کو مستقبل شناس

---

[1] ایڈورڈ ہشتم۔

کس بلندی پر مذاقِ حسن لایا ہے تجھے عشق خود دینے مبارک باد آیا ہے تجھے

ہر نفس دل بر درت نوبت زنِ فریاد باد
سینہ ات از شورشِ غم، شاد باد، آباد باد

ای محبت تجھ کو سجدے، تیری قوت کو سلام جس کی قسمت تو بنائے اسکی قسمت کو سلام
ہے خدائی سے الگ تیرا نظامِ داوری تیری نظریں حکمرانی، تیری ٹھوکر قیصری
شادمانی تیری رفعت کی ہوائے دلفروز غم ترے آتشکدے کا شعلۂ کونین سوز
تیری دنیا ہے بلند اِس عالمِ ناپاک سے طور بنتے ہیں ترے انفاسِ آتشناک سے
جنس و نسل و رنگ سے ہے تیری فطرت بے نیاز کر مکِ ناچیز کامل، اور موسیٰ کا گداز
تیرے آگے کیا بلا ہے احتیاطِ سلطنت اک اشارے سے الٹتی ہے بساطِ سلطنت
زلزلے آتے ہیں محلوں میں تری آواز سے نغمے کیسے! دل بندھے پھرتے ہیں تیرے ساز سے
تیرے ٹھوکرے ہوئے ہاتھوں میں اتنا اختیار اک بھکارن مول لے سکتی ہے تاجِ شہریار
فرش سے تا عرش سب پردے اٹھا دیتی ہے تو بیخودی دیکر خدا سے بھی ملا سکتی ہے تو
پردہ دارِ ماورائے الماورا تو ہی نہ ہو حسنِ ظن کو ہے یہ اندیشہ خدا تو ہی نہ ہو

گر خدائے دیگر است این قوت و ہیجانِ کیست
انقلابِ عالمِ ایجاد، ہر رومانِ کیست

نجاتِ دائمی ہے حسن والوں کی نگاہوں میں جسے آنا ہو آ جائے محبت کی پناہوں میں
دو عالم کو لیے پھرتے ہیں جو اپنی نگاہوں میں وہ جلوے کیا سما سکتے ہیں انساں کی نگاہوں میں
نظر والا نہیں مجھ سا تمھاری جلوہ گاہوں میں میں حیرت کے بتوں کی پیش کرتا ہوں گواہوں میں

جھلک اُس رازِ سربستہ کی ہے میرے گناہوں میں
چھپا رکھا تھا جسکو صوفیوں نے خانقاہوں میں

نہ ہوتا احترامِ عشق اگر اُن کی نگاہوں میں
تو کیوں یہ اہتمامِ حُسن ہوتا کج کلاہوں میں

حریمِ عشق، محرابِ حرم، طاقِ صنم خانہ
اگر تم ہو نگاہوں میں تو سب کچھ ہے نگاہوں میں

وہی اک راہ لی مردِ وفا کی سخت کوشی نے
جو بے نقشِ قدم تھی منزلِ ہستی کی راہوں میں

عجب کیا خاتمہ بالخیر ہو دورِ غلامی کا
کہ اب خو ذہنِ فطرت ہے وطن کے خیر خواہوں میں

تصوّر کی نگاہوں میں جو تم نے وسعتیں دی تھیں
ہم اکثر سیر کر آئے تمھاری سیرگاہوں میں

وفا کی طرح اک دن حُسن بھی اسکو مٹا دیتا
حیاتِ عشق اگر ہوتی نہ فطرت کی پناہوں میں

گناہوں پر وہی انسان کو مجبور کرتی ہے
جو اک بے نام اور فانی سی لذت ہے گناہوں میں

تمھاری موت بھی اک زندگی ہے اے عدم والو
سکوں انگڑائی لیتا ہے تمھاری سیرگاہوں میں

نہ جانے کون ہے گمراہ، کون آگاہِ منزل ہے
ہزاروں کارواں ہیں زندگی کی شاہراہوں میں

گناہوں کی یہاں تعبیر ہوتی ہے نگاہوں سے
نگاہوں میں جو حرف آئے وہی آئے گناہوں میں

غرور ان میں ہے نخوت ان میں ہے کبر و خودی ان میں
یہ جتنے سر جھکے رہتے ہیں رسمی سجدہ گاہوں میں

گھٹو گے دل میں کب تک، پھیل جاؤ داستاں بنکر
کسی دن تا بلب آ جاؤ چھپ کر میری آہوں میں

رہِ منزل میں سب گم ہیں مگر افسوس تو یہ ہے
امیرِ کارواں بھی ہیں انھیں گم کردہ راہوں میں

ہے اک معصوم نعمت کوہ و صحرا کی یہ بے رنگی
نہ آئے حسن سے کہدو ہماری جلوہ گاہوں میں

وہی طور اور وہی دیر و حرم صرف اک تغیر ہے
کہ اب پتھر میں اور بجلی نہیں ہے جلوہ گاہوں میں

ہم اے سیماب دنیائے ادب کے ہیں وہ عرفانی
ہمارا ذکر ہوتا ہے ادب سے بادشاہوں میں

میں تنہا آب و رنگِ بزمِ امکاں ہو نہیں سکتا
یہ دل واپس! اگر تو اس میں مہماں ہو نہیں سکتا

نہ گھبرا بھید اگر اُس کا نمایاں ہو نہیں سکتا
ارے یہ بھی تو عرفاں ہے کہ عرفاں ہو نہیں سکتا

یہاں ہر چیز میں بھر دی گئی ہیں قوتیں کل کی
وہ ذرّہ ہی نہیں ہے جو بیاباں ہو نہیں سکتا

معاذاللہ کمالِ علمِ ہستی کی یہ غایت ہے
کہ انساں واقفِ انجامِ انساں ہو نہیں سکتا

مجھے حیراں نہ کر ہاں میری صورت سے عیاں ہو جا
میں آئینہ تو بن سکتا ہوں حیراں ہو نہیں سکتا

نہیں اک لفظ ایسا دفترِ کونین میں کوئی
جو میری داستانِ دل کا عنواں ہو نہیں سکتا

اُلٹ دے دل کو بھی جب دل کے سب پردے اُلٹ جائیں
اسے بھی کر نمایاں، جو نمایاں ہو نہیں سکتا

شکستہ عالمِ گل ہے تو ہو گی بارشِ گل بھی
وہ ہو مایوس جو خاکِ گلستاں ہو نہیں سکتا

وہاں لائی ہے حرصِ آدمیت منفعل کرنے
جہاں صدیوں میں پیدا ایک انساں ہو نہیں سکتا

امیدیں کچھ محبت کی ہیں، کچھ ہیں حُسن کے وعدے
ابھی شیرازۂ عالم پریشاں ہو نہیں سکتا

محبت کی بلند انجامیوں کا کیا ٹھکانا ہے
فرشتہ بھی شریکِ دردِ انساں ہو نہیں سکتا

نمودِ گل سے خاکِ گل تک اک دُنیا بدلتی ہے
شمارِ انقلاباتِ گلستاں ہو نہیں سکتا

مذاقِ ضبط و قیدِ جبر سے مجبور ہوں اتنا
کہ باوصفِ پریشانی پریشاں ہو نہیں سکتا

سُنا اے چپکے چپکے دل کے پردے کھینچنے والے
تری حدِّ خودی تک وو نمایاں ہو نہیں سکتا

خدا اور ناخدا مل کر ڈبو دیں یہ تو ممکن ہے
مری وجہِ تباہی صرف طوفاں ہو نہیں سکتا

دُعا جائز، خدا برحق، مگر مانگوں تو کیا مانگوں
سمجھتا ہوں کہ میں دُنیا بداماں ہو نہیں سکتا

جوانی بھی گئی سیماب فصلِ گل فشانی بھی
میں اب تا دیر محفل میں غزل خواں ہو نہیں سکتا

معراج

اور ایک لمحۂ فکریہ

کبھی انسان کی پرواز بھی بامِ ثریا تک
ثریا کیا، رسائی اسکی تھی عرشِ معلیٰ تک

کبھی تھیں غازۂ لولاک رفعت بندیاں اسکی
سبھی تھے انجم و افلاک گردِ کارواں اسکی

کبھی اسکی نظر میں وسعتیں کون و مکاں کی تھیں
کبھی اسکے لیے گنجائشیں دو نوں جہاں کی تھیں

فرشتوں میں کبھی تھا منعقد دربارِ عالم اسکا
خیال اس کا تھا جبریلؑ اور قرآں تھا کلام اسکا

تصور میں بلندی فکر میں زورِ رسائی تھا
خدا کے بعد یہ دُنیا میں حق دارِ خدائی تھا

اسیرِ ذلّت و نکبت مگر اب اس کی ہستی ہے
زباں پر اسکی ہُو معراجؐ ذہنیت میں پستی ہے

یہ ہی مغرورِ ماضی کی روایات و حکایت پر
یہ ہی مسرور ذکرِ عہدِ پارینہ کی لذت پر

نہ اس میں حوصلہ پیدا نہ فکرِ ارتقا پیدا
نہیں صدیوں سے آثارِ نگاہِ آشنا پیدا

یہ خاکی اب ہے مصروف ارتفاعِ مادیت میں
ہے اسکی سعی آوارہ سکونِ آدمیت میں

سکوں کی کوششوں میں بے سکونی سانس لیتی ہے
فریبِ عشرتِ باطل اسے امید دیتی ہے

یہ بھٹکا جا رہا ہے راہِ عرفان و حقیقت سے
یہ ہوتا جا رہا ہے دور اپنی فوضویت سے

حکومت چاہتا ہے یہ فضائے بزمِ فانی پر
نہیں جاتی نظر اس کی حیاتِ جاودانی پر

ستارے جانتا ہے ذرّہ ہائے سوز دیدہ کو
بساطِ کہکشاں سمجھا ہے یہ خاکِ تپیدہ کو

یہ برقی قمقمے افلاک کی قندیل ہیں اسکو
یہ طیارے حریفِ شہپرِ جبریل ہیں اسکو

عروجِ مادّیت ہی اسے عرشِ آلٰہی ہے　　مسلسل خواب ہے اور لعنتِ گم کردہ راہی ہے
نہیں اسکی ترقی کے لیے کوئی جہت باقی　　کہ اب انساں میں مطلق نہیں انسانیت باقی
الٰہی ذہنِ روشن، فطرتِ مواج دے اسکو
حضیضِ محض میں پھر قوتِ معراج دے اسکو

عہدِ حاضر کے مسلمان

اوصافِ سلف سے مطلقاً صاف ہیں یہ　　پروردۂ اختلاف و اسراف ہیں یہ
ہے اِن کا ہر اک عمل خلافِ اسلام　　اور کہنے کو اسلام کے اخلاف ہیں یہ

ہے نام و نمود، دین و ایماں ان کا　　سرمایہ و اہرمن ہے یزداں اِن کا
ہیں ان میں تمام غیر قومی اطوار　　یہ خود نہیں، نام ہے مسلماں ان کا

اے شیخ ذرا پکار دیوانوں کو　　آوازۂ اسلام سے بیگانوں کو
تبلیغ اوروں کی پھر بھی ہو جائیگی　　کر پہلے مسلمان مسلمانوں کو

صفی لکھنوی

صفی لکھنوی

اللہ
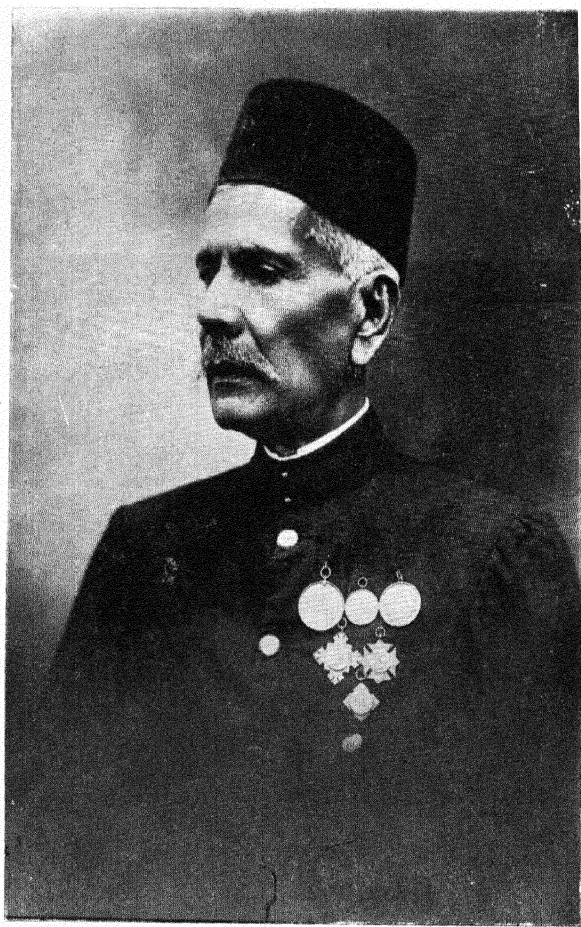
غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ٭ ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

کوئی سیکھ لے دل کی بیتابیوں سے ٭ ہر انجام میں رنگِ آغاز دینا

صفی لکھنوی عفا عنہ
۲۰ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء

صفیؔ لکھنوی

سرگزشت

سید علی نقی نام، صفیؔ تخلص؛ تاریخ ولادت ۳ جنوری ۱۸۶۲ء مطابق یکم رجب ۱۲۷۸ھ، اور قدیم وطن لکھنؤ ہے۔ اِن کے والد مولوی سید فضلِ حسین، آخری تاجدارِ اودھ کے بھائی شاہزادۂ سلیماں قدر بہادر کے معتمد تھے۔

صفیؔ ۵ سال کی عمر میں مکتب نشین ہوئے اور مولوی نجم الدین کاکوروی سے فارسی، اور مولوی احمد علی محمد آبادی سے درسیاتِ عربی و فارسی کی تکمیل کی۔ فنِ طب کی تعلیم حکیم سید باقر حسین صاحب سے ہوئی۔ امین آباد نائٹ اسکول اور کیننگ کالیجئیٹ اسکول لکھنؤ میں انٹرنس تک انگریزی پڑھی۔ اِس کے بعد لال اسکول اور برانچ سکول متعلقۂ کیننگ کالج لکھنؤ میں انگریزی پڑھانے پر مامور ہوگئے۔ جون ۱۸۸۰ء سے اودھ کے محکمۂ دیوانی میں مستقل ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا، اور سلطان پور، رائے بریلی وغیرہ مقامات میں مختلف عہدوں پر رہ کر ۱۹۲۲ء میں سرکاری ملازمت سے پنشن حاصل کی۔

جنابِ صفیؔ، آزاد مسلک، نیک مزاج، خلیق، گوشہ نشین، اور

منصف مزاج شخص ہیں۔ ملی تعصب اور تنگ نظری سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ خلوص اور منکسر المزاجی اِن کا خاص جوہر ہے۔ کہنہ سالی کے باوجود آواز میں ایک خاص کشش اور قوت ہے اور کلام پڑھنے کا طریقہ خاص ہے، جو تحت اللفظ اور ترنم کے بین بین ہے۔

انجمنِ بہارِ ادب کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ اِن کی مثنوی "تنظیم الحیات" پر، ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد نے بحیثیت اعلیٰ نمونہ شاعری کے پانچسو کی رقم بطورِ صلہ مرحمت کی ہے۔ قومی نظموں کے اعتراف میں پبلک نے "لسان القوم" کا لقب دیا ہے اور کئی بار طلائی تمغے پیش کیے ہیں۔

فارسی کلام کا خاصہ مجموعہ ہے، اور کافی تعداد میں متفرق نظمیں اور ایک ضخیم دیوان طبع ہو چکا ہے۔

اِن کا خیال ہے کہ اصنافِ سخن میں غزل ایک ایسی چیز ہے جس میں سب آجاتا ہے، اگر سلیقہ اور ڈھنگ سے کہی جائے۔

ہندی اور سنسکرت کے جو الفاظ زبان میں رائج ہیں، اُن کا استعمال درست سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ کوشش ہونا چاہیے کہ حتی الامکان سادہ اور عام فہم الفاظ استعمال کیے جائیں۔ کیونکہ اُردو زبان ثقیل اور غیر مروج الفاظ کی متحمل نہیں ہوسکتی۔"

شعر کے لیے قافیہ و ردیف ضروری سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "شعر اگرچہ بغیر ردیف کے بھی کہا جا سکتا ہے، لیکن ردیف کے برمحل استعمال سے شعر میں خوبی اور چستی پیدا ہوجاتی ہے۔ بغیر ردیف شعر کی مثال ایسی ہے جیسے بُنی ہوئی چارپائی بغیر ادوان کے۔"

نظم میں میر انیس اور غزل میں میر تقی اور غالب کو اُستاد سمجھتے ہیں۔

انجمن بزم سخن کی دعوت ادب میں مجبوریوں اور ضعیفی کے باعث تشریف نہ لا سکے۔

انتخابِ کلام

رباعی

انسان کو اُس نے خاک سے پاک کیا
ذی حوصلہ و صاحبِ ادراک کیا
پہلے تو بنایا اسے گنجینۂ علم
پھر گنج کو پوشیدہ تہِ خاک کیا

رباعی

غم نقدِ حیات لوٹنے کو ہے
یہ رشتۂ عمر ٹوٹنے کو ہے
پیری میں کمر جھکی تو کیا دم کا قیام
اب تیر کماں سے چھوٹنے کو ہے

غزل

طالبِ دید پہ آنچ آئے یہ منظور نہیں
دل میں ہے ورنہ وہ بجلی جو سرِ طور نہیں
دل سے نزدیک ہیں آنکھوں سے بھی کچھ دور نہیں
مگر اس پہ بھی ملاقات انھیں منظور نہیں
ہم کو پروانہ و بلبل کی رقابت سے غرض
گل میں وہ رنگ نہیں شمع میں وہ نور نہیں
خلوتِ دل نہ سہی کوچۂ شہرگ ہی سہی
پاس رہ کر نہ سہی آپ سے کچھ دور نہیں
ذوقِ پابندیٔ وفا کیوں ہے محرومِ جفا
عشق مجبور سہی حُسن تو مجبور نہیں
تابشِ حُسن نے جب ڈال دیے ہوں پردے
ممکن آنکھوں سے علاجِ دلِ رنجور نہیں
لاؤ میخانے ہی میں کاٹ نہ دیں اتنی رات
مسجدیں ہو گئیں معمور، یہ معمور نہیں
چھیڑ دے سازِ اناالحق جو دوبارہ سرِ دار
بزمِ رنداں میں اب ایسا کوئی منصور نہیں

کبھی، کیسے ہو صفی، پوچھ تو لیتا کوئی

دل دہی کا مگر اس شہر میں دستور نہیں

دردِ آغازِ محبت کا اب انجام نہیں ... زندگی کیا ہے، اگر موت کا پیغام نہیں

کیجیے غور، تو ہر لذتِ دنیا ہے فریب ... کون دانہ ہے یہاں پر جو تہِ دام نہیں

ہے تنزل کہ زمانے نے ترقی کی ہے ... کفر وہ کفر اب اسلام وہ اسلام نہیں

کون آزاد نہیں حلقہ بگوشوں میں ترے ... نقش کس دل کے نگینے پہ ترا نام نہیں

نارسیدہ ہے ترا میوۂ جنت زاہد ... پختہ مغزوں کو تلاشِ ثمرِ خام نہیں

یہی جنت ہے جو حاصل ہو سکونِ خاطر ... اور دوزخ یہی دنیا اگر آرام نہیں.

شعر گوئی کے لیے بس وہی موزوں ہے صفی

جس کو جز فکرِ سخن اور کوئی کام نہیں

کوئی آباد منزل ہم جو ویراں دیکھ لیتے ہیں

بحسرت سوئے چرخِ فتنہ ساماں دیکھ لیتے ہیں

نظر حسن آشنا ٹھہری، وہ خلوت ہو کہ جلوت ہو

جب آنکھیں بند کیں تصویرِ جاناں دیکھ لیتے ہیں

شبِ وعدہ ہمیشہ سے یہی معمول ہے اپنا

سحر تک راہِ شوخِ سُست پیماں دیکھ لیتے ہیں

خدا نے دی ہیں جن روشن دلوں کو دور بیں نظریں

سوادِ کفر میں وہ نورِ ایماں دیکھ لیتے ہیں

دلِ بیتاب کا اصرار، مانعِ شرمِ رسوائی
بچا کر سب کی نظریں سوئے جاناں دیکھ لیتے ہیں

وہ خود سر سے قدم تک ڈوب جاتے ہیں پسینے میں
بھری محفل میں جو اُن کو پشیماں دیکھ لیتے ہیں

ٹپک پڑتے ہیں شبنم کی طرح بے اختیار آنسو
چمن میں جب کبھی گُل ہائے خنداں دیکھ لیتے ہیں

نگاہِ ناز کی مستانہ یہ نشتر زنی کیسی
بوقتِ فصد رگ نے ان بھی رگِ جاں دیکھ لیتے ہیں

اسیرانِ ستم کے پاسبانوں پر ہیں تاکیدیں
بدلتے ہیں جو پہرا قفلِ زنداں دیکھ لیتے ہیں

صفیؔ رہتے ہیں جان و دل فدا کرنے پہ آمادہ
مگر اُس وقت جب انساں کو انساں دیکھ لیتے ہیں

تڑپ کے رات بسر کی جو اک مہم سر کی
چُھری تھی میرے لیے جو شکن تھی بستر کی

عرق عرق ہیں جو گرمی سے روزِ محشر کی
پناہ ڈھونڈھتے ہیں میرے دامنِ تر کی

ہوا گمان اُسی شوخِ سُست پیماں کا
اگر ہوا سے بھی زنجیر ہل گئی در کی

اِسی طرف ترے قرباں، نگاہِ شرم آلود
مجھی پہ تیز ہو یہ باڑھ کُند خنجر کی

خرام وہ جو ہلا دے جگر فرشتوں کا
نگاہ وہ جو اُلٹ دے صفوں کو محشر کی

سجائی حضرتِ واعظ نے کس تکلف سے
متاعِ زہد و ورع سیڑھیوں پہ منبر کی

عبورِ بحرِ حقیقت سے جب نہیں ممکن　　کنارے بیٹھ کے لہریں گنوں سمندر کی

سُنے گا کون سُنی جائے گی صفیؔ کس سے

تمھاری رام کہانی یہ زندگی بھر کی

فراق گورکھپوری

۱۱ مئی ۱۹۴۱ء
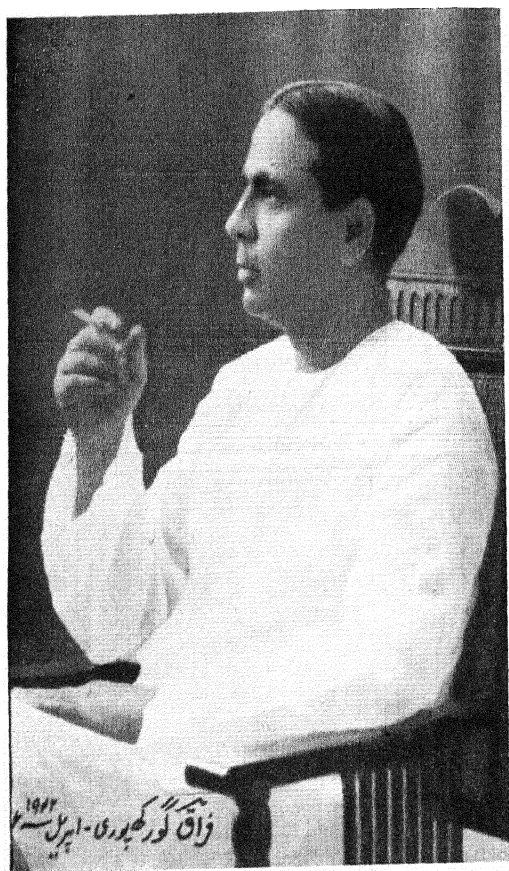
فراقؔ گورکھپوری - اپریل ۱۹۶۲ء

جہاں میں تھی فقط افواہ تیرے جلووں کی
چراغ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

غم حیات وہی دور کائنات وہی
جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگی کیا ہے

تو میرے عشق کا آغاز ہے میں ہوں انجام
یہ سلسلہ تو بہت دور تک پہنچتا ہے

کسی کا کون رہا یوں تو عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

ہزار بار ادھر سے زمانہ گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

آج تو کچھ عشق چونک اٹھا
آج تو بول اٹھے ہیں بتخانے

میں جب پڑھتا تھا وہ اشعار جن میں تھا بیاں تیرا
نمایاں تھا ترے چہرے پہ اک جذبہ رقابت کا

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

کہاں ہر ایک سے بار نشاط اٹھتا ہے
بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

کچھ گراں ہو چلا ہے بار نشاط
آج دکھتے ہیں حسن کے شانے

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری۔

بمقام رامپور - ۱۱ مئی سنہ ۱۹۲۱ء

فراق گورکھپوری

سرگزشت

رگھوپتی سہائے نام، فراقؔ تخلص، سالِ ولادت ۱۸۹۶ء، اور والد کا نام (وکیل) گورکھ پرشاد، عبرتؔ ہے۔

تقریباً چار سو سال سے گورکھپور میں آباد ہیں اور سری واستیو کایستھوں کے خاندان سے تعلق ہے۔ اِن کے بزرگوں کو شیر شاہ نے پانچ گاؤں جاگیر میں دیے تھے، جو ہنوز آباد ہیں اور اسی باعث یہ پنجگانواں کایستھ کہلاتے ہیں۔

فراق سانولے رنگ کے حسّیت و تندرست، مذہبی قیود و تعصبات سے آزاد، روشن خیال اور ہنس مکھ انسان ہیں۔

معمولی اُردو پڑھ کر انگریزی کی طرف توجہ کی۔ ۱۹۱۳ء میں گورکھپور سے انٹرنس اور ۱۹۱۵ء میں ایف، اے کا امتحان فارسی کے ساتھ پاس کیا۔ بعد ازیں شادی ہوگئی۔ بی، اے کے بعد والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور تفکراتِ دنیا نے آگھیرا۔

فراق ڈپٹی کلکٹر بھی رہے، یونیورسٹی میں پروفیسر بھی، اور آئی، سی، ایس، کے لیے بھی نامزد ہوئے، لیکن ازدواجی زندگی نے اتنا بیدل کردیا

تھا کہ حبِ وطن اور خدمتِ خلق کی خاطر تمام ملازمتوں سے انکار کرکے ۱۹۲۱ء میں کانگریس میں شامل ہوگئے اور قید و بند کی تمام مصیبتیں جھیلیں۔ اس کے بعد کرسچین کالج میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ آج کل الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لیکچرار ہیں۔

ذوقِ شاعری لڑکپن سے تھا، لیکن سب سے پہلی غزل ۱۹۱۶ء میں کہی، جب کہ بی، اے، میں تعلیم پا رہے تھے۔

اپنی شاعری کے متعلق فرمایا ہے کہ

"میں زیادہ تر امیرِ مینائی کا متبع ہوں، اور چونکہ عزیز لکھنوی، شاد عظیم آبادی، ناصری، مولانا حسرت، اصغر، یگانہ، اور علامہ اقبال کے کلام کو اصلاحِ خیال کی نظر سے دیکھا ہے، اس لیے ان "تاثرات" سے بھی کلام رنگین ہے۔"

اِن کو دیگر اساتذہ کے حسبِ ذیل اشعار پسند ہیں:-

غالب
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق ای خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

یگانہ
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

"
کہاں وہم و گماں اتنے، حقائق ہر طرف جتنے
نگاہِ نارسا، یہ نقدِ فطرت رائیگاں کیوں ہو

حسرت
خلوص اب ہم یہ لائیں گے کہاں سے
نکل کر حلقۂ پیرِ مغاں سے

"
دیجیے عرضِ تمنا کی اجازت دیجیے
آپ فرمائیں گے کہ جب خاموش ہو جائیں گے ہم

اِن کا خیال ہے کہ اُردو زبان میں ہندی اور سنسکرت کے وہ جملہ الفاظ استعمال کرنا چاہییں جو مذاقِ سلیم پر گراں نہ ہوں۔
نظم اور غزل دونوں میں علامہ اقبال کو اُستاد مانتے ہیں۔ کلام کا ایک مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی سے اشعار کہتے ہیں، اور طرزِ جدید کے خلاف ہیں۔

انتخابِ کلام

کچھ اپنا آشنا کیوں اے دلِ ناداں نہیں ہوتا
کہ آئے دن یہ ننگِ گردشِ دوراں نہیں ہوتا

ریاضِ دہر میں جھوٹی ہنسی بھی ہم نے دیکھی ہے
گلستاں دربغل ہر غنچۂ خنداں نہیں ہوتا

یقیں لائیں تو کیا لائیں، جو شک لائیں تو کیا لائیں
کہ باتوں میں تری سچ جھوٹ کا امکاں نہیں ہوتا

سکوں نا آشنا رہتے ہیں رہ کر بھی ترے وحشی
کہ دامانِ بیاباں دامنِ جاناں نہیں ہوتا

قسم تیری، تجھے پا کر بھی تجھ کو پا نہیں سکتے
یہ عقدہ حل بھی ہو کر عقدۂ آساں نہیں ہوتا

خلوصِ عشق برحق، دیدۂ پرنم بجا، لیکن
غمِ ہجراں بھی سنتے ہیں غمِ جاناں نہیں ہوتا

نگاہِ اہلِ دل کے انقلاب آتے ہیں دنیا میں
یقیں رکھ عشق اتنا بے سر و ساماں نہیں ہوتا

فضائل لاکھ ہوں، لیکن محبت ہی نہیں جس میں
فرشتہ ہو، خدا ہو، کچھ بھی ہو انساں نہیں ہوتا

نگاہیں آشنا کیوں جان کر انجان بنتی ہیں
کیے جا اپنی سی تدبیر میں شاداں نہیں ہوتا
اُمڈ آئے جو آنسو انقلاب اِس کو نہیں کہتے
کہ ناداں ہر تموّج بحر کا طوفاں نہیں ہوتا
فراقؔ اک اک سے بڑھ کر چارہ سازِ درد ہیں لیکن
یہ دُنیا ہے یہاں ہر درد کا درماں نہیں ہوتا

فسردہ پا کے محبت کو مسکراتے جا
اب آگیا ہے تو اک آگ سی لگائے جا
اِس اضطراب میں رازِ فروغ پنہاں ہے
طلوعِ صبح کے مانند تھرتھرائے جا
جہاں کو دیگی محبت کی تیغ آبِ حیات
ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا
مٹا مٹا کے محبت سنوار دیتی ہے
بگڑ بگڑ کے یونہیں زندگی بنائے جا
وہ کیمیا ہی سہی، پہلے خاک ہونا ہے
ابھی تو سوزِ نہانی کی آنچ کھائے جا
ابھی تو اے غمِ پنہاں جہان بدلا ہے
ابھی کچھ اور زمانے کے کام آئے جا
کھلیں نہ حسن کی فطرت کے راز عاشق سے
برتِ خلوص بھی جھوٹی قسم بھی کھائے جا
خلوصِ عشق کو کرلو اور اے غفلتِ ہوش
کسی کو یاد کے پردے میں کچھ بھلائے جا
شباب پر ہے زمانہ ترے ستم کے نثار
اُبھر رہا ہوں کئی رنگ سے مٹائے جا
فراقؔ چھیڑ دیا تو نے کیا فسانۂ درد
سمجھ میں کچھ نہیں آتا مگر سنائے جا

دلِ افسردوں کے اب وہ وقت کی گھاتیں نہیں ہوتیں
کسی کا درد اُٹھے جن میں وہ راتیں نہیں ہوتیں

ہم آہنگی بھی تیری دوریٔ قربت نما نکلی
کہ تجھ سے مل کے بھی تجھ سے ملاقاتیں نہیں ہوتیں

یہ دورِ آسماں بدلا کہ اب بھی وقت پر بادل
برستے ہیں مگر اگلی سی برساتیں نہیں ہوتیں

زبان و گوش کی ناکامیوں کا کچھ ٹھکانا ہے
کہ باتیں ہو کے بھی تجھ سے کبھی باتیں نہیں ہوتیں

وہ عالم اور ہی ہے جس میں گہری نیند آتی ہے
خوشی و غم میں سونے کے لیے راتیں نہیں ہوتیں

ارے واعظ تری رسمِ عبادت میں دھرا کیا ہے
نگاہیں اہلِ دل کی کب مناجاتیں نہیں ہوتیں

سمجھ کچھ رازِ حسن و عشق کے شبہائے فرقت میں
کہ رونے کے لیے یہ دکھ بھری راتیں نہیں ہوتیں

سبب کچھ اور ہے یا اتفاقاتِ زمانہ ہیں
کہ اب تجھ سے بھی پہلی سی ملاقاتیں نہیں ہوتیں

فراقؔ اس دور کے اہلِ نظر سے ہے پیام اپنا
حقائق ہوتے ہیں اشعار میں باتیں نہیں ہوتیں

بلائے ناگہانی بھی پیامِ زندگانی بھی
قیامت ہی قیامت یہ تری اٹھتی جوانی بھی

مٹا کر ہم کو مٹ جاتا ہے غم بھی شادمانی بھی
ازل ہی سے ہے یہ دنیا حقیقت بھی کہانی بھی

پہاڑوں کی ہے سختی تو گزر اس میں ہو دریا کا
ملا وہ دل محبت کو جو پتھر بھی ہے پانی بھی

نہ پائی راہ دل میں گو غمِ دُنیا نے بھی لیکن
کہاں ہے آج ایسی تیرے غم کی پاسبانی بھی

غمِ دوراں کا رکھ کچھ دھیان اپنا غم سُنانے میں
کہ اک دن ختم ہو جائے گی ناداں یہ کہانی بھی

خطِ تقدیر اپنا پڑھ چکا ہوں بار ہا لیکن
نگاہِ یار آخر کوئی پیغامِ زبانی بھی

گلستاں در گرہ لب شبنمستان در کنار آنکھیں
کہ ہے صبحِ بہاراں اس کا غم بھی شادمانی بھی

نگاہوں کا وہ عالم دیدنی ہے جب جھلکتی ہے
کسی کی نرگسِ معصوم میں کچھ بدگمانی بھی

ہمیں غش کھا گئے ہیں شعلۂ آواز پر اپنے
ہمیں نے بارہا دی ہے صدائے لن ترانی بھی

عجب کیا اہلِ عالم اب اگر ہمدرد ہو جائیں
کہ کچھ کم ہو چلا ہے سوزِ غم ہائے نہانی بھی

نگاہِ ناز کے اُٹھتے ہی اے رنگِ رُخِ جاناں
چھلکنا سیکھ لے تجھ سے شرابِ ارغوانی بھی

فراقؔ اس دور کو دورِ عمل کہتے تو ہیں لیکن
رہے گی یاد دُنیا کو تری جادو بیانی بھی

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

بھول جاتے ہیں کسی کو مگر ایسا بھی نہیں
یاد کرتے ہیں کسی کو مگر اتنا بھی نہیں

تم نے پوچھا بھی نہیں میں نے بتایا بھی نہیں
کیا مگر راز وہ ایسا تھا کہ جانا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
ہائے اب مجھ سے تجھے رنجشِ بیجا بھی نہیں

فطرتِ حسن تو معلوم ہے تجھ کو ہمدم
چارہ ہی کیا ہے بجز صبر سو ہوتا بھی نہیں

نگہِ ناز کی نیت کا پتہ بھی نہیں اور
دلِ دیوانہ کا معلوم ارادا بھی نہیں

بیخودی ہوش نما ہوش بھی غفلت آسا
اِن نگاہوں نے کہیں کا مجھے رکھا بھی نہیں

یوں تو ہنگامے اُٹھاتے نہیں دیوانۂ عشق
مگر اے دوست کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

تجھ سے سنبھلیں تو سنبھال اپنے حجابِ بیباک
ہیں اُٹھانا حدِ آداب تماشا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اِس جلوہ گہِ ناز سے اُٹھتا بھی نہیں

آج غفلت بھی اِن آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
اور دلِ ہجر نصیب آج شکیبا بھی نہیں

ہم اُسے مُنہ سے بُرا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ
دوست تیرا ہے مگر آدمی اچھا بھی نہیں

عشق کے ہاتھوں دل و جاں شاد ہیں آباد ہیں
رہ گئیں تیری جفائیں وہ بھی کچھ کچھ یاد ہیں

عشق والوں کی نہ پوچھو شاد ہیں آباد ہیں
سو طرح آباد ہو کر سو طرح برباد ہیں

بس انھیں کے فیض سے ویرانیاں آباد ہیں
ہر ادائے حسن میں سو عالمِ ایجاد ہیں

زندگی پر ایک تہمت ہے یہ نظمِ زندگی
عشق پر جس طرح سب الزام بے بنیاد ہیں

آج تک خونِ تمنّا سے بسی ہیں جنّتیں
تیرے اُٹھتے درد سے سینے ابھی آباد ہیں

کیا عجب نکلے جو کارِ حسن بھی کارِ دراز
ہم اسیرانِ ستم قیدیٔ بے بُنیاد ہیں

یہ جُھکی نظریں تری یہ زیرِ لب باتیں تری
داستاں در داستاں رُوداد در رُوداد ہیں

رباعی

خلقت کو سنوار دے عبادت کیا ہے
دُنیا کا شباب آئے جنت کیا ہے
ہاں میکدۂ جہاں کا ذرّہ ذرّہ
سرشارِ مجاز ہو حقیقت کیا ہے

کیفی دہلوی

۲۲ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء
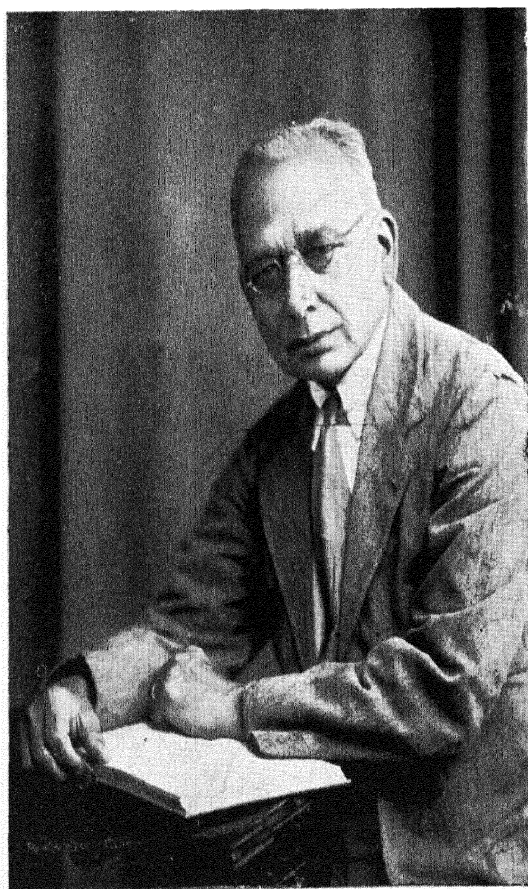
کیفی دہلوی

مرکز ادب کا روحِ سخن رامپور ہے

یہ شمع وہ ہے جس کا زمانے میں نور ہے

سب حکمراں کے عدل و کرم سے ہیں چین میں

میرے خیال میں تو یہ آرامپور ہے

---

۲۵ / مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

برجموہن دتاتریہ کیفی

کیفی دہلوی

سرگزشت

برج موہن نام، اور کیفی تخلص ہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پنڈت کنہیا لال ہے، اور قوم کے دتاتریہ پنڈت ہیں۔

اِن کے بزرگ بادشاہِ فرخ سیر کے زمانے میں کشمیر سے دلی آئے، اور سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر مامور رہے۔ پنڈت کنہیا لال نابھے میں کوتوال تھے۔ باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم محلے کے مدرسے میں ہوئی۔ فارسی کی تکمیل اپنے نانا سے کی، اور انگریزی کی تعلیم سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں پائی۔

کیفی کوتاہ قد، موزوں اندام، گندمی رنگ، آفتابی چہرہ، فراخ چشم اور کشادہ پیشانی انسان ہیں، وضع قطع اور لباس انگریزی ہے۔ حافظہ نہایت قوی پایا ہے۔ شعر تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ دوپہر کو کبھی آرام نہیں کرتے اور شب میں گیارہ بجے سے پہلے نہیں سوتے۔ حقے کا بید شوق ہے اور عموماً سادہ غذا کھاتے ہیں۔

خیالات کی بلندی، ہمدردیٔ قوم و وطن، شاعرانہ شوخی و لطافت

اور وسعتِ اخلاق کا مجسمہ ہیں۔

شادی، پنڈت اجودھیا ناتھ شیو پوری (لکھنؤ) کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ بارہ سال کا عرصہ ہوا کہ رفیقۂ حیات کا انتقال ہو چکا۔ متعدد اولادوں میں سے اس وقت دو فرزند بقیدِ حیات ہیں۔

بڑے پنڈت پیارے موہن دتا تریہ بی، اے ایل، ایل، بی، اخبارِ ٹربیون کے فرسٹ اڈیٹر اور چھوٹے سریندر موہن ایم، اے، بی، ٹی، لائل پور کالج میں پروفیسر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

جنابِ کیفی کو شاعری کی دولت اپنے ایک خاندانی بزرگ پنڈت نرائن داس ضمیر دہلوی سے ورثے میں ملی ہے۔ آغازِ مشق میں غزل گوئی کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ پھر علامہ حالی، حضرتِ آزاد، اور مولانا شبلی جیسے اکابر کی صحبت اور مغربی ادب کے تاثرات سے نیچرل شاعری شروع کی۔ اصنافِ شاعری میں روحانی اور اخلاقی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔

اردو ادب کی ترقی کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ

(الف) خواندگی بڑھائی جائے۔

(ب) سستی کتابیں کار آمد موضوعوں پر سہل زبان میں شائع کی جائیں۔

(ج) ایسے نشر کرنے والے ادارے قایم کیے جائیں، جو مقامی اور ملی تنگ نظری سے مبرّا ہوں۔

(د) مقابلے کے مضامین اور نظمیں وغیرہ لکھوائی جائیں اور انعام دیے جائیں۔

(ہ) مُسلّم ادیبوں اور مصنفوں کو جو آسودگی کے طالب ہوں سول پنشن عطا کی جائے۔

(د) فرانس اکیڈمی جیسا ایک ادارہ قایم کیا جائے۔

اِن کے علاوہ اُردو کی خدمت کے اور بھی راستے ہیں، جو کام شروع کرنے سے خود بخود سامنے آجائیں گے"۔

اِن کا خیال ہے کہ "اُردو زبان میں ہندی اور سنسکرت وغیرہ کے شمول کے جو اُصول متوسطین کی نظر میں تھے، ہم کو بھی وہی سامنے رکھنا چاہییں۔ یعنی تارید اور اپنانا۔ "منشورات"[1] میں اُردو لسانیات کے عنوان پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ ایسے الفاظ تصرف سے اجنبی نہیں رہتے بلکہ اُردو میں گھُل مِل جاتے ہیں"۔

ردیف و قافیہ کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اِن قیود میں وہاں تک رہنا مناسب ہے، جہاں تک مضمون ہاتھ سے نہ جائے، اور شاعر کے تخیل کی مزاحمت نہ ہو۔ غزل میں ردیف ایک لطف اور شان پیدا کر دیتی ہے۔

دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار یہ ہیں:-

ذوقؔ
اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مومنؔ
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالبؔ
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

---

[1] منشورات حضرتِ کیفی کی ایک تصنیف ہے۔

داغ — جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
چھپ کر رہیں گے مجھ سے وہ ایسے کہاں کے ہیں

چکبست — زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

نظم و غزل میں صرف سیماب اکبر آبادی کو استاد سمجھتے ہیں۔
نظم میں حسبِ ذیل کتب طبع ہو چکی ہیں:-

(۱) پریم ترنگی۔
(۲) مسدس۔
(۳) بھارت درپن۔
(۴) آئینۂ ہند۔
(۵) شوکتِ ہند۔
(۶) جگ بیتی۔
(۷) واردات (دیوان)
(۸) متفرق خمسۂ کیفی۔
(۹) ناگزیر قیل و قال۔
(۱۰) خمخانۂ کیفی۔
(۱۱) مرآتِ خیال۔

۱۹۱۵-۱۶ء میں یورپ کا سفر کیا، اور علمی و ادبی حلقوں کے سربرآوردوں سے ملاقاتیں کیں۔
کچھ عرصہ ہوا کہ ریاست کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سیکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد ریاست چنینی (پہاڑی ریاست)

میں کلکٹر رہے اور اب دلّی میں مولانا عبدالحق صاحب کے ساتھ ترویج و ترقیٔ اُردو کا کام کر رہے ہیں۔

انتخابِ کلام

فلسفۂ حیات

کیوں سہم گیا جا کے تو گورستاں میں
گورستاں بھی ہے عالمِ امکاں میں
مرتا نہیں، رہتا ہے ہمیشہ زندہ
ایثار ہو نیکی ہو اگر انساں میں

دن رات غمِ موت میں آہیں بھرنا
ہے رب کی ودیعت کو معطل کرنا
دس چھوڑ کے جیتے بندے، جاتا ہی ایک
فرمایئے جینا ہے کہ ہے یہ مرنا

شباب اور پیری

یہ شکوہ یہ شغلِ نوحہ خوانی کیسا؟
یہ ذکرِ فنائے زندگانی کیسا؟
تو بطن سے مادر کے جواں نکلا تھا
پیری میں پھر افسوسِ جوانی کیسا؟

حوصلہ اور استقلال

آفات و مصائب سے کبھی منہ مت موڑ
دل ٹوٹ گیا تو اِس کا مشکل ہے جوڑ
ہے شکوۂ آسمان و قسمت بیجا
چھوڑے تجھے کل زمانہ، تو جی مت چھوڑ

غزل

فراہم ہو کے خونِ آرزو پھر دل نہ بن جائے
یہ اجڑی پُرسکوں بستی بھری محفل نہ بن جائے
نہ ہو ہر موئے تن میں جبتک احساس اِک رگِ جاں کا
تو جانبازی و جذبِ عشق میں کامل نہ بن جائے
وہ جلوہ ہو عیاں دیر و حرم کیا ذرّے ذرّے میں
جو تیری ذات ہی اِک پردۂ حائل نہ بن جائے
جماعت کی مسلّم قابلیت ہو تو کیوں کر ہو
ہر اک فرد اس کا جب تک جوہرِ قابل نہ بن جائے
وطن کی ساکھ ہو تم تو جوانو کب یہ ممکن ہے
کہ فخرِ حال و ماضی شانِ مستقبل نہ بن جائے
ہجومِ یاس و ناکامی میں گر ہمت رہے قائم
تو پھر کوشش تمھاری سعیِ بے حاصل نہ بن جائے
فرشتے تک بھی حظِ نفس سے ہارے ہیں بچ اس سے
کہیں چاہِ زنخداں ہی چہِ بابل نہ بن جائے

زباں کے مسئلے پر یہ خدنگ اندازیاں کیسی
کہیں یہ خاک تودۂ گنبدِ بابل نہ بن جائے

کبھی بحرِ محبت سے نہ بیڑا پار ہوا اس کا
فرازِ موجِ طوفاں ہی جسے ساحل نہ بن جائے

جو از خود رفتہ راہِ عشق میں ہیں، ہو نہیں سکتا
کہ منزل اُن کے حق میں دوریٔ منزل نہ بن جائے

تمھیں ہو رازدارِ عشق بس اب چپ رہو کیفی
فسانہ اِک جہاں کا وارداتِ دل نہ بن جائے

راحت کہاں نصیب تھی جواب کہیں نہیں — وہ آسماں نہیں ہے کہ اب وہ زمیں نہیں
ہو جوشِ صدق دل میں تو راحت بغل میں ہے — قائم پھر آسماں رہے یا زمیں نہیں
حبِّ وطن کو ہمتِ مردانہ چاہیے — درکار آہِ سینۂ اندوہ گیں نہیں
خونِ دل و جگر سے اسے سینچ اے عزیز — کشتِ وطن ہے یہ کوئی کشتِ زمیں نہیں
جنگِ وطن میں صدق کے ہتھیار کا ہی کام — درکار اس میں اسلحۂ آہنیں نہیں
جس بات پر عزیز اڑے ہیں اڑے رہیں — کہنے دیں انکو اونچے گلے سے نہیں نہیں

کیفی اسی سے حریتِ ہند میں ہے دیر
حبِّ وطن کا جوش کہیں ہے کہیں نہیں

حُسن کی رنگینیاں سب جلوہ ساماں ہو گئیں
دل کی آنکھیں سربسر امین بداماں ہو گئیں

جب تعلق اور تعین سے ہوا آزاد دل
بدعتیں کہتے ہیں جن کو روحِ ایماں ہو گئیں
مختلف آغاز سے نکلا بہت انجامِ عشق
سب وہ دور اندیشیاں خوابِ پریشاں ہو گئیں
رفتہ رفتہ اُٹھ گئی معشوق و عاشق کی تمیز
عشق کی سب مشکلیں اس طرح آساں ہو گئیں
جلوہ بے پردہ تھا، فرطِ شوق نے ڈالی نقاب
یہ نگاہیں مضطرب ہو کر پریشاں ہو گئیں
حریت کیسی عمل کی جب محرک ہو غرض
نیتیں آوارگی سے پابجولاں ہو گئیں
دو لہو کی بوندیں رکھ چھوڑی تھیں چشمِ شوق میں
وہ بھی اب آویزۂ تارِ گریباں ہو گئیں
جن امیدوں سے بنا تھا خانۂ دل رشکِ غم
اب وہی اس گھر کی بربادی کو طوفاں ہو گئیں
تھیں جو چیزیں ساری دنیا کیلئے سہل الحصول
ہائے کیا قسمت ہے وہ بھی میرا ارماں ہو گئیں
ناز والوں کے سلوکوں نے کیا صبر آشنا
بے نیازی کی ادائیں مجھ پہ احساں ہو گئیں

یاس ہے قطعِ عمل، امید تجدیدِ عمل
پھر بسیں گی بستیاں جو آج ویراں ہو گئیں
تھیں وہ اگلی صورتیں محویت آرا کس قدر
دیکھ مٹ مٹ کر بھی زیبِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
حشر تک اہلِ جہاں وہم و گماں ہی میں رہے
دہر کی نیرنگیاں کیا فتنہ ساماں ہو گئیں
کس قدر رم شیوہ ہیں کیفی ادائیں حُسن کی
چھائیں عالم پر، کبھی سینے میں پنہاں ہو گئیں

شاعر کی تمنّا

بزم میں آئے ہیں آج اک بات کہہ جانے کو ہم
ایک گُر بھولا ہوا، ہیں پھر سے بتلانے کو ہم
یہ نہ سمجھے کوئی، ہیں جذبات بھڑکانے کو ہم
وہ نہیں جو یاس کے لے بیٹھیں افسانے کو ہم
ہم نہیں وہ جن کی امیدوں کا مرقد دل میں ہے
ہم کو حاصل منفعت ہر سعی لاحاصل میں ہے
السلام اے نکتہ سنج، اے شاعرِ شیوا بیاں
ایک نغموں سے ترے معمور ہے سارا جہاں

اے تخیل کے دھنی اے والیٔ علم و زباں
آج کرتے ہیں تری خدمت میں کچھ گستاخیاں

ہم تمنّا پر تری اک تبصرہ کرنے کو ہیں
آج تیری آرزو کا تجزیہ کرنے کو ہیں

سب سے پہلے تو یہی ہے ایک تیرے دل کی چاہ
مشعرے میں شعر پر تیرے ہو شورِ واہ واہ
سب کہیں مضموں نیا، اسلوب کی دلکش ہے راہ
وِرد ہو تو اس قدر، ہو سامعیں کے لب پہ واہ

تیرا ایک ایک لفظ بیٹھے دل میں اہلِ بزم کے
تذکرے ہوں بزم کے یا معرکے ہوں رزم کے

پھر یہی ہے نا تمنا تیری اے معجز رقم
ہو رسالوں پر ترا اور تجھ پہ ہو آن کا کرم
اور پھر یہ چاہتا ہے تو، مرے اہلِ قلم
صاحبِ دیواں بھی ہو جائیں کہیں جلدی سے ہم

جب تلک پڑیوں میں بندھ جاتا نہیں تیرا کلام
تو سمجھتا ہے کہ ہے محرومِ البقائے دوام

داعیہ تیرا بلند، اونچا ہے تیرا حوصلہ
یہ تمنا ہے ترے دل میں یہی ہے ولولہ

ہر کہیں دُنیا میں ہو تیرے سخن کا غلغلہ
مات چورن والے کی بانی ہو جس سے بر ملا
تجھ سے سما کے ستاروں کی بھی شہرت ماند ہو
چرخ پر تشہیر کے تو چودھویں کا چاند ہو

تجھ کو اُٹھتی ہے تصوف کی ہڑک بھی گاہ گاہ
اولیاء اللہ کا بن بیٹھتا ہے خضرِ راہ
جو سنا ہے یا پڑھا کرتا ہے خوب اُس کا نباہ
تو خدائی اور خودی دونوں کو کرتا ہے تباہ
مادیت کی ترے پیروں میں گو زنجیر ہے
پر سخن دیکھو تو قرآں، وید کی تفسیر ہے

حُسن جس کا راگ تو گاتا رہا شام و سحر
عشق گھائل جس سے تو کھتا ہی دل ہی درجگر
ہجر جس نے کر دیا ہے تجھ کو مُردہ سے بتر
وصل جس کے پیچھے سرگرداں رہا تو عمر بھر
اصلیت اِن کی ہے جو کچھ سب ہمیں معلوم ہے
تو نہیں مجنوں جنونی عاصیٔ معصوم ہے

تو غلو سے کام لے اے دوست یا مطلق نہ لے
راہ پر تو واقعیت کی، کہ فطرت پر چلے

گاتے یا دکھلائے تو کتھک کے فن کے چوچلے
یہ جو کچھ بھی ہیں فقط ہیں ابتدا کے مرحلے

ابتدا ناقص ہے تیری انتہا بھی نادرست
مبتدا بے ربط ہو تو ہو خبر کس طرح چست

وہ تمنّا کیا ہے جو ہو فرض سے نا آشنا
برق رفتاری وہ کیا جب بوجھ کندھے سے گرا
نغمہ وہ کیسا ہے، بادی سر ہو جس کا بے پتا
کیا وہ نقاشی ہے جب ہو کارٹون اُس پر فدا

تو ہی کہہ وہ کیفیت جو تجھ پہ وارد ہی نہیں
کیا سروکار، اُس کی عکاسی سے تجھ کو نکتہ بیں

یہ ترے افعال اور تیری تمنائیں فضول
تجھ کو ٹھہرا کر رہیں اِس جون میں اپریل فول
ایک ہی چھینٹے میں بہ جائیں گے یہ کاغذ کے پھول
کام کی اِک بات بتلاتے ہیں سُن اُسکو نہ بھول

تجھ کو حاصل ہو وہ فن جس میں ہے جادو کا اثر
چھوڑ وہ وہمی تمنّا آ ادھر کچھ کام کر

تجھ کو تو تخئیلِ عالی پر بہت کچھ ناز ہے
سر ستی کا در ترے مُنھ پر ہمیشہ باز ہے

جذب اور تاثیر سے بھی تجھ کو سوز و ساز ہے
چھیننے میں دل کے تیرا کلک سحر انداز ہے

اُٹھ یہ میدانِ عمل ہے دوست تیرے سامنے
قوتوں سے اپنی خدمت میں وطن کے کام لے

حریت قطعاً سیاسی اور ملکی ہی نہیں
حریت دنیاوی آزادی و دینی ہی نہیں
حریت ایمان کی اور اعتقادی ہی نہیں
حریت خود اختیاری اقتصادی ہی نہیں

حریت تخئیل کی بھی اک حقیقی چیز ہے
اس کو حاصل کر، اگر تجھ کو ذرا تمئیز ہے

یہ تمنا جب ترے سینے میں گھر کر جائے گی
جو تشخص کی تجھے حسرت ہے وہ مر جائے گی
کُل فضا اپنے وطن کی امن سے بھر جائے گی
جو بُری ساعت وطن پر ہے، مفر ہو جائے گی

کاش یہ دُھن ہو تجھے، یہ ہی تمنا دل میں ہو
جوشِ اُخوت اور حب کا دیس کی محفل میں ہو

سچ تو یہ ہے سچے شاعر کی تمنا ہے یہی
کر دے کوثر سے جو مستغنی وہ صہبا ہے یہی

جس سے روشن ہو جہاں وہ طورِ سینا ہے یہی
مست کر دے اِنس و جاں کو وہ ترانا ہے یہی
اُٹھ ہلا دے تو عزیزوں کے دلِ بے جوش کو
صورِ اسرافیل کر دے بربطِ خاموش کو

ماہرالقادری

۱۳ر جنوری سنہ ۱۹۴۱ء
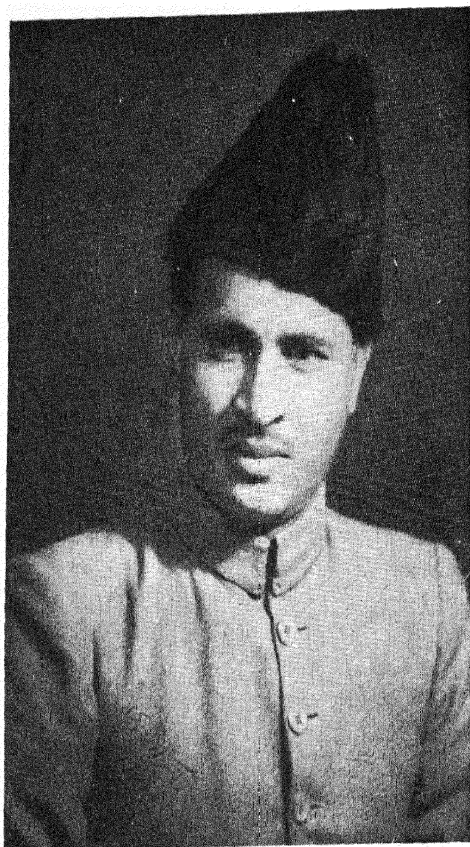
ماہر القادری

نمونۂ تعلیق

سوزِ ناتمام

وہی عقل کی پرستش، وہی جوشِ حق کی خامی ۔ نہ وہ جراتِ کلیمی نہ وہ ذوقِ ہمکلامی

ہے روز و شب کی فطرت جو بدل سکو بدل دو ۔ کہ نہیں قبول مجھ کو یہ سپہر کی غلامی

میں زباں سے کیوں کہوں کچھ مری خامشی ہے سب کچھ ۔ مری ہر نظر گزارش، مرا ہر نفس پیامی

ہے سوزِ دل کی قیمت، نہ فقط اک نگاہِ الفت ۔ ترے دردِ دل کا سودا، یہی شہرتِ دوامی

نئے کارواں کی منزل ہے تمام تر سیاست ۔ نہ جنوں کی اب ضرورت، نہ وہ ذوقِ خوش خرامی

مجھے کیا پیام دے گی تری زندگی کی دنیا ۔ کہ فنا کی وادیوں میں مجھے دی گئی سلامی

مرے حالِ مضطرب پر ابھی ہنس رہی ہے دنیا ۔ ابھی تو عمل کر رہا ہے مرا سوزِ ناتمامی

مجھے ڈر ہے کاہلوں کو نہ خراب جہل کر دے ۔ یہ غرورِ علم و دانش، یہ جنونِ پختہ کامی

مجھے زندگی کی خاطر نہیں ذلتیں گوارا ۔ مجھے راس ہیں مصیبت، مجھے موت ہے غلامی

مرے دل نے آج ماہر کوئی جیزان سے مانگی
یہ نگارِ مستِ خسرو، یہ سرورِ بلب جامی

[illegible]

۷ جون ۱۹۷۱ء

ماہر القادری

ماہر القادری

سرگزشت

منظور حسین نام، ماہر تخلص، سالِ ولادت ۱۳۲۴ھ اور وطن قصبہ کیسر کلاں ضلع بلند شہر ہے۔ ان کے والد محمد معشوق علی، ظریف تخلص کرتے تھے اور حمد و نعت لکھا کرتے تھے۔

نسباً شیخ قریشی اور حضرتِ خواجہ عبیداللہ احرار کی اولاد میں ہیں خود فرماتے ہیں کہ "ہمارے خاندان کی تاریخ امارت و دولت کی روایت سے خالی ہے، اور مجھے فخر ہے کہ میں امیر گھرانے میں پیدا نہیں ہوا"۔

سات سال کی عمر میں والدہ کا اور اٹھارہ سال کے سن میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

اول گاؤں کے مکتب میں قرآنِ مجید ختم کیا۔ پھر والد سے اردو فارسی پڑھی۔ ریاضی سے ہمیشہ نفرت رہی۔ ۱۹۲۴ء میں الہ آباد سے میٹرک میں شریک ہوئے، مگر فیل ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد تلاشِ معاش کی فکر میں گرفتار ہو کر بظاہر تعلیم ترک کر دی، لیکن معنًا مطالعے کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ چونکہ علوم و آداب سے فطری مناسبت ہے، اس لیے مذہب،

اور تاریخ کا خاصا مطالعہ کیا ہے۔

ماہر کی آواز میں پُر اثر لحن ہے۔ خوبصورت خط و خال اور بلند بالا قد ہے۔ چہرے سے متانت و سنجیدگی ٹپکتی ہے۔ اخلاق میں وسعت، اور مزاج میں سادگی ہے۔ بزرگوں سے عقیدت مندی، اور مذہب کی پابندی ورثے میں ملی ہے۔

شاعری میں تلمذ کسی سے نہیں اور نہ صلاحِ سخن کے قائل ہیں۔

ان کے نزدیک شاعری کا وہ پہلو اہم ہے جس کے ذریعے قلب میں تسکین اور روح میں انقلاب پیدا ہوسکے۔ یہ اقتصادیات اور معاشیات وغیرہ کی رہنمائی سے شاعری کو بالاتر سمجھتے ہیں۔

کلام میں ردیف و قافیہ کو ضروری سمجھتے ہیں اور بغیر ردیف و قافیہ کی شاعری کو جس کا نام لوگوں نے "ترقی پسند شاعری" رکھا ہے، دماغی پستی اور ذہنی غلامی کی آخری سرحد جانتے ہیں۔

اِن کے نزدیک ہندی اور سنسکرت کے مزید الفاظ کا شمول ناروا ہے۔ اور مروجہ زبان میں کسی قسم کے تغیر کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتے۔

اُردو ادب کی سب سے بڑی خدمت اِسے جانتے ہیں کہ اُردو سے ذوق رکھنے والے ہر مہینے کتابیں خریدنا اپنے اوپر فرض کرلیں۔ اس طرح مصنفین کی ہمت افزائی ہوگی اور اچھی اچھی کتابیں منظرِ عام پر آسکیں گی۔

علامہ اقبال کے یہ چند اشعار اِن کو بہت پسند ہیں:۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا   یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ   بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ   صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں   مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے   ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم   نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسمٰعیل

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو   جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں   تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے   اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

ظہورِ قدسی، محسوساتِ ماہرؔ، ماہر القادری کے سو شعر، یہ تین مجموعے منظوم کلام کے شائع ہو چکے ہیں۔ مصروفیاتِ معاش کی تگ و دو کے بعد جو وقت بچتا ہے، کتابیں دیکھنے اور نظم و نثر لکھنے میں صرف کرتے ہیں۔

۱۹۳۳ء میں سفرِ عراق کیا، اور بغداد شریف میں ایک ماہ رہ کر ایک نظم بعنوان "بغداد کے چمن میں ایک شام" لکھی جو مشہور ہے۔
کلام زیادہ تر از بر اور کلام پڑھنے کا طریقہ بجد دل کش ہے۔

انتخابِ کلام

جمنا کا کنارہ

ساون کی گھٹا اور وہ جمنا کا کنارا
وہ منظرِ دلچسپ وہ رنگین نظارا

جامن کے درختوں سے جو کچھ آگے بڑھا میں
آئی نظر آتی ہوئی ایک شعلہ رخِ دل آرا

اللہ رے اٹھلائی ہوئی چال کی شوخی
رک جائے جسے دیکھ کے بہتا ہوا دھارا

نکھرے ہوئے ماتھے پہ وہ رنگین سا قشقہ
جس طرح گھٹاؤں میں دمکتا ہوا تارا

قشقے پہ وہ چاندی کا چمکتا ہوا جھومر
جس طرح کہ انگارے پہ بکھرا ہوا پارا

لہریں جو قریب آئیں تو دامن کو سنبھالا
اک ہاتھ سے نقشین سی گاگر کو اتارا

پہلے تو ہر اک شے کو بڑے غور سے دیکھا
پھر جھک کے بڑے ناز سے ہاتھوں کو نکھارا

پیروں کے کڑوں کو کبھی بچھوؤں کو گھمایا
گاگر کو اچھالا کبھی بالوں کو سنوارا

پانی سے چھلکتی ہوئی گاگر کو اٹھایا
لیتے ہوئے معصوم اداؤں کا سہارا

آتا مجھے دیکھا تو وہ جھجکی کبھی ٹھٹکی
شاید مرا آنا نہ ہوا اس کو گوارا

دیکھا نہ گیا حسن کی مجبوری کا عالم
میں اس سے یہ کہتا ہوا بستی کو سدھارا

او بتکدۂ ہند کے بے ترشے ہوئے بت
بخشم بہ نگاہِ تو سمرقند و بخارا

یکبارہ بایں ناز بیا بر لبِ جمنا
یک فرصتِ نظارہ بدہ باز خدا را

فرصتِ آگہی بھی دی لذتِ بیخودی بھی دی
موت کے ساتھ ساتھ ہی آپ نے آگہی بھی دی

سوزِ دروں عطا کیا، جرأتِ عاشقی بھی دی
اُن کی نگاہِ ناز نے غم ہی نہیں خوشی بھی دی

اُس نے نیاز و ناز کے سارے ورق اُلٹ دیے
دستِ خلیل بھی دیا صنعتِ آذری بھی دی

پھر بھی مری نگاہ میں دونوں جہاں سیاہ تھے
میری شبِ فراق کو چاند نے روشنی بھی دی

آپ نے اِک نگاہ میں سب کو نہال کر دیا
پھول کو مسکراہٹیں، موج کو بے کلی بھی دی

چھین لو مجھ سے دوستو طاقتِ عرضِ مدعا
اس نے مزاجِ یار کو دعوتِ برہمی بھی دی

دامِ تعینات میں دیدہ و دل اُلجھ گئے
سوزِ یقیں کے ساتھ ساتھ لذتِ کافری بھی دی

ماہرِ دل فگار پر آپ کی یہ نوازشیں
فطرتِ عاشقی بھی دی دولتِ شاعری بھی دی

دل کی ہر چوٹ اُبھر آئی ہے
کس قیامت کی گھٹا چھائی ہے

عشق رسوائی ہی رسوائی ہے
درد بدنام، تمنا رسوا،

دل دھڑکنے کی صدا آئی ہے
اُس نے پھر یاد کیا ہے شاید

زلف و رخسار کا منظر، توبہ، شام اور صبح کی یکجائی ہے
ہم سے چھپ چھپ کے سنورنے والے چشمِ آئینہ تماشائی ہے
دل تمنا سے ہے کتنا بیزار ٹھوکریں کھا کے سمجھ آئی ہے

تم سے ماہرؔ کو نہیں کوئی گلہ
اُس نے قسمت ہی بُری پائی ہے

وہ ہنس ہنس کے وعدے کیے جا رہے ہیں فریبِ تمنّا دیے جا رہے ہیں
ترا نام لے کر جیے جا رہے ہیں گناہِ محبت کیے جا رہے ہیں
مرے زخمِ دل کا مقدر تو دیکھو نگاہوں سے ٹانکے دیے جا رہے ہیں
نہ کالی گھٹائیں نہ پھولوں کا موسم مگر پینے والے پیے جا رہے ہیں
تری محفلِ ناز سے اُٹھنے والے نگاہوں میں تجھ کو لیے جا رہے ہیں
مرے شوقِ دیدار کا حال سُن کر قیامت کے وعدے کیے جا رہے ہیں
حریمِ تجلّی میں ذوقِ نظر سے نگاہوں سے سجدے کیے جا رہے ہیں

ابھی ہے اسیری کا آغاز، ماہرؔ
ابھی تو فقط پَر سیے جا رہے ہیں

کچھ اِس طرح نگاہ سے اظہار کر گئے جیسے وہ مجھ کو واقفِ اسرار کر گئے
اقرار کر دیا، کبھی انکار کر گئے بیخود بنا دیا، کبھی ہشیار کر گئے
یکتائیٔ جمال کی حیرت نہ پوچھیے ہر ماسوا کے وہم سے بیزار کر گئے
کچھ اس ادا سے جلوۂ معنیٰ کی شرح کی میرے خیال و فکر کو بیدار کر گئے
اللہ رے! اُن کے جلوۂ رنگیں کی فطرتیں سارے جہاں کو نقشِ بدیوار کر گئے

وعدے کا اُن کے ذکر ہی ماہرؔ فضول ہے
تم کیا کرو گے، وہ اگر انکار کر گئے

ہر نفس میں دل کی بیتابی بڑھاتے جائیے
دور رہ کر بھی مرے نزدیک آتے جائیے

اک ذرا تھم تھم کے پردے کو اُٹھاتے جائیے
دیکھنے والوں کی نظریں آزماتے جائیے

میرے اِس ظلمت کدے کو جگمگاتے جائیے
ہو سکے تو میری خاطر مسکراتے جائیے

پھر اُسی انداز سے نظریں ملاتے جائیے
دیکھنے والوں کی نظریں آزماتے جائیے

یا کوئی تسکین کی صورت بتاتے جائیے
یا پھر اپنی یاد سے غافل بناتے جائیے

رفتہ رفتہ خود کو دیوانہ بناتے جائیے
حُسن کی دلچسپیوں کے کام آتے جائیے

رہ گیا ہے آرزوؤں کا لرزتا سا چراغ
جاتے جاتے آج اِس کو بھی بجھاتے جائیے

عقل کہتی ہے دوبارہ آزمانا جہل ہے
دل یہ کہتا ہے فریبِ دوست کھاتے جائیے

کفر و ایماں کے سوا بھی کچھ مناظر اور ہیں
اُن کے ہر انداز پر ایمان لاتے جائیے

آ ہی جائے گا کوئی قسمت کا مارا فیس بھی
ہر طرف دامِ رُخِ لیلیٰ بچھاتے جائیے

میں نے کچھ فطرت ہی پائی ہے عجب مشکل پسند
میری ہر مشکل کو مشکل تر بناتے جائیے

یاد ہے ماہرؔ مجھے اُن کا وہ کہنا یاد ہے
آج تو بس رات بھر غزلیں سناتے جائیے

تلوک چند محروم

۲۲ نومبر ۱۹۸۱ء

تلوک چند محروم

محروم! فصلِ گل کا ہمیں انتظار کیا — زندہ کریگی مُردوں کو بادِ بہار کیا؟

غم تازہ ہے دلِ مُردہ کا، الم آرزوئے فسردہ کا

ترے اس زمانہ میں دیکھ دیکھ کے اہتمام نئے نئے!

عالم رواں دواں کا پتہ پوچھتے ہو کیا — دنیا میں سب ہے لشکر کہ مسافر سفر میں ہے!

ہے خاتمہ قریب جوانی کی رات کا — محروم بجز فسانۂ زلفِ بتاں نہ چھیڑ

شبِ ہجراں کی صورت دن ڈھلے سے پھر نظر آئی

الٰہی بھیج دے صبحِ قیامت شام کے بدلے!

پُر ہے نوحوں سے زیست کا دیواں — ناسمجھ اس کو یہ ترانے ہیں

دل میں کہتے ہیں کہ کاش آئے ہوتے — اُن کے آنے سے جو بیمار کا حال اچھا ہے!

چمن اندر چمن حسن جہاں افروز ہے تیرا — مگر وہ ہے مری منزل بیاباں در بیاباں ہے!

کون مختار ہے دنیائے وفا میں اے دل! — جو ہے مجبور ہے کہ تو ہی تو مجبور نہیں

بیدار کرنے میں ممکن اگرچہ خواب — جو کچھ ہے خواب ہے دلِ بیدار کیلئے!

مقام رامپور — ۲۲ نومبر ۱۹۴۱ء

تلوک چند محروم

تلوک چند محروم

سرگزشت

تلوک چند نام، اور محرومؔ تخلص ہے۔ ۱۸۸۷ء میں موضع عیسیٰ خیل ضلع میانوالی (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ اِن کے اجداد اصلاً زراعت پیشہ تھے۔ لیکن آراضی دریا بُرد ہوجانے سے دُکان داری اور بیوپار شروع کردیا تھا۔

جناب محرومؔ نے پہلے ورناکیولر مڈل اور ۱۹۰۴ء میں انٹرنس، پھر ایف، اے، اور بی، اے اور ایس، اے، وی، کے امتحانات نجی طور پر پاس کیے۔ ۱۹۰۸ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے جے، اے، وی کا امتحان پاس کرنے پر مشن ہائی اسکول ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں بطورِ جونیر انگلش ماسٹر مقرر ہوئے، ۱۹۱۲ء میں بھرا تری ہائی اسکول ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں چلے آئے، اور ۱۹۱۶ء میں بوجہ وفاتِ اہلیہ عیسیٰ خیل میں آکر میونسپل بورڈ اسکول میں اول سکنڈ ماسٹر اور بعد میں بطورِ ہیڈ ماسٹر ۱۹۲۵ء تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک مڈل اسکول کلورکوٹ ضلع میانوالی میں ہیڈ ماسٹر رہے، اور ۱۹۳۳ء سے آج تک کنٹونمنٹ بورڈ اسکول راولپنڈی کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔

مگر عنقریب پنشن پر سبکدوش ہونے والے ہیں۔

دورانِ ملازمت میں حالات ناسازگار رہے جس کا اظہار اِن اشعار میں کیا ہے۔

سی و چار سالِ عمرم بہ ملازمت بسر شد — سحرِ شباب خود را ہمہ تیرہ شام کردم

شرفم بعہدِ پیری چہ بود کہ در جوانی — بہ سگاں ادب نمودم، بہ خراں سلام کردم

طبیعت میں موزونی فطری تھی۔ فرماتے ہیں کہ:۔

”تیسرے کلاس میں پڑھتا تھا کہ خود بخود مصرعے زبان پر آنے لگے۔ چونکہ مادری زبان ملتانی ہے، صحیح اُردو سے لڑکپن میں واقفیت نہ ہوسکی۔ وہ زمانہ تو دُور رہا۔ آج تک روز مرۂ اہلِ زبان پر قدرت نہیں۔“

جنابِ محروم چھریرے جسم کے کتابی چہرے اور مناسب قد والے فراخ چشم، کشادہ پیشانی، اور متین شاعر ہیں۔

ان کا خاص موضوع، اخلاقی، اور اصلاحی نظمیں ہیں، جن سے بچوں اور نوجوانوں کی اِصلاح و تعلیم کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اور یہی ان کی شاعری کا اہم پہلو ہے۔

دیگر زبانوں کے غیر مانوس الفاظ، خواہ ہندی یا فارسی کے ہوں یا سنسکرت اور عربی کے، اُردو میں استعمال نہیں کرتے۔ لیکن جو الفاظ گھُل مِل گئے ہیں، اور سامع کو اُن کے سمجھنے اور سُننے میں گرانی نہیں ہوتی، اُنھیں اشعار میں لکھنا مناسب سمجھتے ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ زبانِ اُردو کی وسعت کے لیے عربی و فارسی اور دیگر زبانوں کے رواں ترجمے کیے جائیں۔

کلام میں ردیف و قافیے کی پابندیوں کو لازم قرار دیتے ہیں۔

اس لیے کہ اس التزام سے اشعار کا لطف بڑھ جاتا ہے اور رنگینی آجاتی ہے۔

تلمذ کسی سے اختیار نہیں کیا، لیکن نظم میں چکبست، سرور جہاں آبادی، اور علامہ اقبال کو استاد مانتے ہیں، اور غزل میں میرزا غالب اور میر کے قائل ہیں۔

دیگر اساتذہ کے یہ اشعار اِن کے زبان زد ہیں:-

ذوق
کل گئے تھے تم جسے بیارِ ہجراں چھوڑ کر
چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

میر نیرنگ
میر نیرنگ تو دِوانے ہیں
اِن کی باتوں پہ نہیں جائیے گا

آسی
لب بہ لب ہے آج تجھ سے تیرے دیوانے کی خاک
خوب پہچان اے بتِ مے نوش پیمانے کی خاک

غالب
واعظ نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

ذوق
ممکن نہیں علائقِ دُنیا سے چھوٹنا
جب تک کہ روح کو ہے تعلق بدن کے ساتھ

اقبال
چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندیٔ رسمِ فغاں تک ہے

بیان یزدانی
اُن کا منجملۂ اربابِ وفا ہو جانا
میرے نزدیک ہی بندے کا خدا ہو جانا

سنہ ۱۹۱۶ء میں ایک مجموعہ "کلامِ محروم" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

اِس کے بعد "کلامِ محروم حصہ دوم" شائع ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں ایک اور ضخیم مجموعہ "گنجِ معانی" کے نام سے طبع ہوا ہے۔

اکثر نظمیں مدارس اور اسکول کے چھوٹے بڑے درجات کی درسی کتابوں میں داخل ہو چکی ہیں۔

متاہل زندگی کی یادگار دُو لڑکیاں اور ایک لڑکا جگناتھ آرزو (بی، اے) باقی ہے۔ آرزو کی طبیعت کو بھی شعر و سخن سے خاص لگاؤ ہے۔

انتخابِ کلام

قطعہ

اگرچہ ہم نکل آئے ہیں گھر سے دور بہت — نہیں ذرا غمِ غربت، کہ رام پور آئے
یہ وہ جگہ ہے کہ پاتا ہے دل سرورِ جہاں — یہ وہ مقام ہے آنکھوں میں جس سے نور آئے

غزل

ہم دل جلوں کو اے بُتِ نامہرباں نہ چھیڑ — بھڑکے گا اور شعلۂ سوزِ نہاں نہ چھیڑ
صیاد اور خزاں کے ستم اس پہ کم نہیں — تو عندلیبِ زار کو اے باغباں نہ چھیڑ
ہے ہے! کسی کی بزم مجھے یاد آگئی — واعظ خدا کے واسطے ذکرِ جناں نہ چھیڑ
دنیا میں اے زباں روشِ صلحِ کل نہ چھوڑ — جس سے کسی کو رنج ہو ایسا بیاں نہ چھیڑ
ہمدم کہیں نہ حسرتِ خوابیدہ جاگ اُٹھے — ایامِ حسن و عشق کی پھر داستاں نہ چھیڑ

ہے خاتمہ قریب جوانی کی رات کا
محرومؔ، پھر فسانۂ زلفِ بتاں نہ چھیڑ

رہی فراق میں بھی شکل روبرو تیری — شبیہ کھینچی تصور نے ہو بہو تیری
معاف رکھ جو ہے گلہائے تر سے پیار مجھے — کہ ان میں رنگ ترا کچھ ہے کچھ ہے بو تیری
نسیمِ صبح کا جھونکا نفس نفس تیرا — رہے گی سوختہ جانوں کو آرزو تیری
یہ فخر کم نہیں ہم لائقِ خطاب تو ہیں — عزیز اوروں کے القاب سے ہے، تو تیری

وہاں غنچۂ تر سے زبانِ سوسن سے — چمن چمن میں سنی میں نے گفتگو تیری
دل و جگر بھی پھکے جاتے ہیں سوزِ ہجراں سے — لگن عذاب ہوئی مجھ کو شمع رو تیری

کہاں کہاں ترے محروم کو بقولِ سرور
کشاں کشاں لیے پھرتی ہے جستجو تیری

کچھ نئے داغ کچھ پرانے ہیں — آج اُن کو سبھی دکھانے ہیں
پُر ہے نوحوں سے زیست کا دیواں — ناسخنداں کو یہ ترانے ہیں
کوہ و صحرا و ساحل و دریا — بے ٹھکانوں کے سو ٹھکانے ہیں
عمرِ انساں ہے ایک لحظہ، مگر — اِس میں کیا مختلف زمانے ہیں
بوسے ذکرِ وفائے لیلےٰ پر — یہ حکایات ہیں، فسانے ہیں
لے چلا دل کسی کی محفل میں — موت آنے کے سو بہانے ہیں

ہم بھی ایسے نئے نہیں محروم
یہ جفا میں اگر پرانے ہیں

یہ قفس اور اس میں ہیں افسردہ و ناشاد ہم — خانہ پروردِ چمن ہیں آخر اے صیاد ہم
پھر بہار آئی، ہوئے پھر مائلِ فریاد ہم — کرتے ہیں کنجِ قفس میں بزمِ گل کو یاد ہم
رشکِ جنت فصلِ گل میں ہیں فضائیں دہر کی — اور قفس میں مضطرب ہیں آشیاں برباد ہم
ہمصفیرانِ چمن سے جا کے کہنا اے صبا — میہماں ہیں کوئی دم کے کشتۂ بیداد ہم

یادِ نسرین و سمن میں دل پہ لاکھوں داغ ہیں
مثلِ محرومِ حزیں غربت میں ہیں ناشاد ہم

ہم جو آہ و فغاں نہیں کرتے — آپ کا امتحاں نہیں کرتے

جان و دل دیکے عاشقانِ غیور — ناز برداریاں نہیں کرتے
روز نامہربانیاں ہم پر — یوں تو اے مہرباں نہیں کرتے
جنسِ نایاب ہے دلِ بیتاب — پھر بھی اس کو گراں نہیں کرتے
عقل کو کیوں بتائیں عشق کا راز — غیر کو رازداں نہیں کرتے
زندگانی ہے آن پر مرنا — مرد پروائے جاں نہیں کرتے

یادِ ایامِ شوق سے محروم
دل کو اب ہم تپاں نہیں کرتے

عشق کی دُنیا میں جنسِ غم کو ارزاں کر دیا
ہم غریبوں کے لیے جینے کا ساماں کر دیا
زیست کی دشواریوں نے یہ تو احساں کر دیا
موت سی مشکل کو میرے حق میں آساں کر دیا
حُسن کی جاں بخشیاں دیں تو نے اے حُسن آفریں
آہ لیکن پھر اُسی کو دشمنِ جاں کر دیا
میں تو جب جانوں کہ میرے دل کی بیتابی مٹے
کیا ہوا اگر آئینے کو تم نے حیراں کر دیا
کر دیا ظاہر وہ کچھ جس سے پریشاں ہو نظر
جس سے ہو تسکینِ دل وہ راز پنہاں کر دیا
شوق سے جا کر علاجِ کشتگانِ شوق کر
دل کو ہم نے بے نیازِ درد و درماں کر دیا

ہے یہ دنیا ایک ہی افسانۂ ناکامِ شوق
جس نے جو چاہا الگ تجویز عنواں کر دیا

باعثِ انبساط ہو آمدِ نو بہار کیا
رنگِ چمن دکھائے گا سینۂ داغدار کیا

عہد پہ اعتماد کیوں، وعدے کا اعتبار کیا
دیکھیے امید کس لیے کیجیے انتظار کیا

تلخ ہے زیست کیجیے کس لیے تلخ تر اسے
خرمیٔ گذشتہ کو روئیے بار بار کیا

شامِ وصال ہی ہوں کیا محوِ فریبِ آرزو
یاد نہیں رہی ہمیں صبحِ وداعِ یار کیا

طبعِ سخنوری تلک کانِ گہر سے کم نہیں
سامنے شعرِ تر کے ہے گوہرِ آبدار کیا

ہر نظارے میں ہے سو پرتوِ جاناں پیدا
کیوں نہ ہو دیکھنے والے میں نئی جاں پیدا

طربِ دل سے بیاباں بھی ہو رشکِ گلشن
دل ہو ناخوش تو ہو گلشن میں بیاباں پیدا

جنکی تقدیس کی کھاتے ہیں فرشتے بھی قسم
ہم گنہگاروں میں ہوتے ہیں وہ انساں پیدا

کر ہی ڈالے گی ہوائے چمنِ دہر ملول
صورتِ گل بھی اگر کوئی ہو خنداں پیدا

ظلمتِ یاس میں امید کی پنہاں تھی جھلک
پردۂ شب سے ہوا نیّرِ تاباں پیدا

غیب سے ہمتِ مردانہ کو ملتی ہے مدد
عزم راسخ ہو تو ہو جاتے ہیں ساماں پیدا

حق نے شاعر کے تخیل کو وہ قدرت بخشی
ذرّۂ خاک سے کر دے چمنستاں پیدا

خواتینِ ہند

حق نے بخشا ہے عجب جوہرِ اشیاران کو	خود پرستی ہے نہ شہرت سے سروکاران کو
چشمِ خورشید نے دیکھا نہیں بےکاران کو	کوکبِ صبح نے پایا ہے تو بیداران کو
خوابِ غفلت سے تعلق نہیں زنہاران کو	دی ہے اللہ نے وہ فطرتِ ہشیاران کو
حسن و دولت نہ کریں مائلِ پنداران کو	عار نخوت سے ہے خدمت سے نہیں عاران کو
جاں فدا آن پہ کرنا نہیں دشواران کو	آزمایا ہے زمانے نے کئی باران کو

شمعیں ظاہر میں ہیں باطن میں یہ پروانے ہیں
ان کی جرأت کے جو قائل نہیں دیوانے ہیں

آفتاب

اے شمعِ دل فروزِ شبستانِ کائنات	تیری کرن کرن ہے رگِ جانِ کائنات
تو مرکزِ ثبات ہے دورِ حیات کا	ہے تجھ سے اہتمام دو روزہ ثبات کا
سرچشمہ زندگی کا ہے دریا ہے نور کا	مقصد بہت وسیع ہے تیرے ظہور کا
ہنگامہ زندگی کا ترے دم سے گرم ہے	یہ بزم تیری تابشِ پیہم سے گرم ہے

تو رہروِ بقا کے لیے شمعِ راہ ہے
تیرا وجود حسنِ ازل پر گواہ ہے

رباعی

محروم جہاں سے کے قضا جائے گی
واں شاعری واعری نہ کام آئے گی
پیری ہے فکرِ عاقبت کر ناداں
کیا فکرِ سخن نجات دلوائے گی؟

دل خوش نہ ہوا، ملال پیوستہ رہا
بدحال رہا، خراب اور خستہ رہا
بے سود ہوئیں ادھر اُدھر کی باتیں
سربستہ جو راز تھا وہ سربستہ رہا

ہے شعر و سخن کو فکرِ رنگیں درکار
یہ پھول کھلاتی ہے جوانی کی بہار
داماںِ خزاں میں گلِ خوش رنگ کہاں
پیری میں نہ رکھ امیدِ رنگیں اشعار

انجامِ حیات اب نظر آتا ہے
معلوم نہیں بُرا ہے یا اچھا ہے
کی عمر تمام شاعری میں ہم نے
باتوں باتوں میں یہ سفر کاٹا ہے

انند نرائن، ملّا

۱۳ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

ملا لکھنوی

خلوتِ آزاد

ممکن ہے خاک میرا خود خاک سر بسر ہوں ۔ دامِ حیات میں اک مرغِ شکستہ پر ہوں

پالا ہے مجھ کو لیکن تاروں بھرے فلک نے ۔ اس تیرہ خاکداں میں اک جلوۂ سحر ہوں

ہوں عشرتِ خاک لیکن فردوسِ در نظر ہوں

اے ارضِ صنم، مائدہ یہی منتہائے خلوت ہے ۔ مری اور تیری یکجائی میں پنہاں وحدت ہے

حیاتِ جاوداں دونوں کو ملنا اب یقینی ہے ۔ اگر شک ہے تو اس میں ہے کہ کس کی بدولت ہے

آنند نرائن ملا ۔
۱۳ فروری سنہ ۶۱ء

انند نرائن مُلّا

سرگزشت

انند نرائن مُلّا، ابنِ پنڈت جگت نرائن مُلّا، ابنِ کالی سہائے مُلّا، ابنِ سیتارام مُلّا، سنہ ۱۹۰۱ء میں محلہ رانی کٹرہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان کشمیری ہے، مگر اِن کے مورثِ اعلیٰ سیتا رام مُلّا نے کلکتے میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ وہاں سے اس خاندان نے لکھنؤ کا رُخ کیا، اور اب یہی وطن ہے۔

انند نرائن مُلّا نے دس سال کی عمر میں گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ میں (اب گورنمنٹ جوبلی انٹرمیجیٹ کالج ہے) تعلیم شروع کی۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں انٹرنس، سنہ ۱۹۱۹ء میں ایف، اے، سنہ ۱۹۲۱ء میں بی، اے سنہ ۱۹۲۳ء میں ایم، اے، اور سنہ ۱۹۲۵ء میں ال، ال، بی پاس کیا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں آئی، سی، ایس، کے امتحان میں بھی شرکت کی تھی، مگر انتخاب میں نہ آسکے۔

انگریزی تعلیم کے دور میں اُردو فارسی کی تعلیم گھر پر مولوی محمد برکت اللہ صاحب فرنگی محلی سے ہوتی رہی۔ اِن کو شعر و شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ اکثر پڑھاتے پڑھاتے شعر کہنے میں مصروف ہوجاتے تھے

اور ۵۰، ۶۰ شعر سے کم نہیں کہتے تھے۔

اس زمانے میں جنابِ ملاؔ کو شعر و سخن سے اس قدر تنفر تھا کہ اُستاد کے شعر اصرار کے باوجود پڑھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ لیکن کالج کے اندر انگریزی میں کچھ کچھ نظم کرنے کی عادت ہوگئی۔ چنانچہ میر انیسؔ کی چند رباعیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جو کالج میگزین میں طبع ہوا اور بنظرِ پسندیدگی دیکھا گیا۔

۱۹۲۳ء میں صحت خراب ہوگئی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ بستر پہ لیٹا رہنا بہتر ہے۔ پڑے پڑے دل گھبرا جاتا تھا، اِس لیے کتابیں دیکھا کرتے۔ اس زمانے میں علامہ اقبالؔ کا ایک مجموعہ "پیامِ مشرق" طبع ہوا تھا۔ اِس کی نظم "لالۂ طور" کا انگریزی ترجمہ لیٹے لیٹے کر ڈالا، جو حلقۂ احباب میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

اپنے اُستاد پنڈت منوہر زتشی ہیڈ ماسٹر جوبلی اسکول کے اصرار پر پہلی نظم بعنوانِ "پرستارِ حُسن" ۱۹۲۷ء میں لکھی جو "زمانہ" میں ایک ایڈیٹوریل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔ اِس کے بعد اُن کا اصرار اور بڑھ گیا اور ملاؔ مستقل نظم کہنے لگے۔ بہار مرحوم کے کہنے پر انجمنِ "معین الادب" کے ممبر بھی بن گئے۔

ملاؔ سفید رنگ، موزوں قد، فراخ چشم، خوش وضع، اور متین و مہذب انسان ہیں، کلام پڑھنے کا طریقہ مناسب ہے۔

شعر و سخن میں کسی سے تلمذ نہیں، اور نہ اس کو مناسب سمجھتے ہیں ردیف و قافیہ سامنے رکھ کر اشعار کم کہتے ہیں۔ چنانچہ طرح کی غزلیں بہت کم ہوتی ہیں۔

۹۔ فروری ۱۹۲۳ء کو شادی ہوئی اور اسی سال سے لکھنؤ میں وکالت شروع کی، وکالت ان کا خاندانی پیشہ ہے۔ حافظہ خداداد ہے۔ شعر ارادۃً نہیں کہتے بلکہ چلتے پھرتے کہا کرتے ہیں۔

اِن کے نزدیک شاعری کا ایک پہلو خلوص و صداقت ہے۔ اور

"خلوص و صداقت اُسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ شاعر اُن باتوں کا ذکر کرے جو اُس کی زندگی سے قریب تر ہوں اور جن کا اُس نے خود احساس کیا ہو، اور یہ ایسے شخص کی انفرادی فطرت پر منحصر ہے کہ اُس کے ذاتی تجربات اور احساسات، اقتصادی معاملات، معاشی حالات، یا روحانی کیفیات میں سے کس سے وابستہ ہیں"

اُردو زبان میں دیگر زبانوں کے الفاظ کے شمول کے متعلق فرماتے ہیں کہ:-

"اُس کے لیے کوئی حد مقرر نہیں، بلکہ جہاں تک زبان قبول کرے۔ اب رہا اندازے کا سوال کہ زبان قبول کرتی ہے یا نہیں، تو یہ ایک فرد کے لیے مشکل ہے۔ لیکن وہ الفاظ جو عام فہم ہیں، اگر اُن کے مترادف الفاظ پیشتر سے زبان میں موجود ہیں، تو بھی اِن کے استعمال کو ناپسند نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اِس طرح زبان کی وسعت کو نقصان پہنچتا ہے۔ مترادف الفاظ کے مفہوم میں بہت زیادہ اختلاف ہوتے ہیں اور جتنے زیادہ ہم معنیٰ الفاظ ایک زبان میں شامل ہوجائیں گے، اُتنا ہی اُن نازک اختلافات کو ادا کرنے کے لیے الفاظ کا فرق بڑھتا چلا جائے گا۔ اور یہ دیکھنے والے کی قابلیت پر ہوگا کہ وہ کون لفظ انتخاب کرتا ہے کہ وہی لفظ اُس کے مفہوم کی صحیح ترجمانی کرسکے گا۔

رہا اُردو زبان کی خدمت کا سوال تو اس طرف ساری توجہ مبذول ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر زبان وسیع ہوتی ہے تو اُردو کی ترقی ہوتی ہے اور ایسا ہونا جب ہی ممکن ہے کہ عوام کی زبان بننے کی صلاحیت دکھا سکے۔

جو کوشش اُردو پھیلانے کی اور اُردو کا پیام عوام تک پہنچانیکی کی جائے گی وہی اُردو ادب کے بقا کی ضامن ہوگی"

ردیف و قافیے کی ضرورت کے بارے میں ان کا ارشاد ہے کہ

" قافیہ اور ردیف سے ایک آہنگ ضرور پیدا ہو جاتا ہے جس سے تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ شاعر کی قابلیت پر منحصر ہے کہ اِس آہنگ سے مدد لیے بغیر اپنے پیام میں اتنی تاثیر اور دلکشی پیدا کر دے کہ سننے والوں کو اِس آہنگ کی غیر موجودگی محسوس نہ ہو۔ اور زبانوں میں قافیہ و ردیف کی اتنی سختی نہیں ہے جتنی کہ اُردو میں۔ اور پڑھنے والوں کو اِس کی کمی بھی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ غالبًا آہنگ کو ضروری سمجھنا کسی قدر ہماری عادت کا بھی نتیجہ ہے، کیوں کہ ہم ہمیشہ با قافیہ اور با ردیف نظمیں پڑھتے اور سنتے چلے آئے ہیں"

دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار یہ ہیں:-

اقبالؔ

اچھا ہے ساتھ دل کے رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جوشؔ

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ جوش و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ انساں سخت ناہموار ہے ساقی

جگرؔ

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

یگانہ
ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گا

آسی
صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تونے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

جنابِ ملاؔ نظم میں اقبالؔ، اور جوشؔ کو اور غزل میں غالبؔ، فانیؔ اور جگرؔ کو استاد مانتے ہیں۔

انتخابِ کلام

گزری حیات وہ نہ ہوئے مہرباں کبھی
سنتے تھے ہم کہ عشق نہیں رائیگاں کبھی

اتنا تو یاد سا ہے کہ ہم تھے جواں کبھی
پھرتی ہیں کچھ نگاہ میں پرچھائیاں کبھی

دو گل قفس میں رکھ کے نہ صیّاد دے فریب
دیکھا ہی ہم نے جیسے نہیں آشیاں کبھی

بھولے ہوئے ہو تم تو دلائیں گے ہم نہ یاد
ہم تم بھی راہِ زیست میں تھے ہم عناں کبھی

ویرانیٔ نگاہ پہ میری نہ جائیے
پلتی تھیں اسکے سایے میں بھی بجلیاں کبھی

ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہِ لطف
پھر خوں کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی

مُلّا بنا دیا ہے اسے بھی محاذِ جنگ
اِک صلح کا پیام تھی اُردو زباں کبھی

تابِ جلوہ بھی تو ہو وہ سوئے بام آیا تو کیا
چشمِ موسیٰ لیکے عشقِ تشنہ کام آیا تو کیا

کر دیا اِک بار اُس کا پیکرِ خاکی تو سرخ
خونِ دل گر خنجرِ قاتل کے کام آیا تو کیا

مدعائے دل سمجھ لیں گے اگر چاہیں گے وہ
میرے ہونٹوں تک سوالِ ناتمام آیا تو کیا

گر چکی اک بار جب بجلی نگاہِ شوق پر
طور کی چوٹی سے پھر کوئی پیام آیا تو کیا

ظرفِ سائل بھی بدل اے رحمتِ بندہ نواز
مے سے پُر اُن کانپتے ہاتھوں میں جام آیا تو کیا

پُر ہے تیرے ذکر سے اپنی حدیثِ زندگی
اس میں بھولے سے اگر دل کا بھی نام آیا تو کیا

خونِ دل ضائع نہ ہو مجھکو بس اتنی فکر ہے
اپنے کام آیا تو کیا غیروں کے کام آیا تو کیا

ہیں ابھی خاکسترِ مُلّا میں کچھ چنگاریاں
شعلۂ ہستی قریبِ اختتام آیا تو کیا

مری بات کا جو یقیں نہیں، مجھے آزما کے بھی دیکھ لے

تجھے دل تو کب کا میں دے چکا، اسے غم بنا کے بھی دیکھ لے

یہ تو ٹھیک ہے کہ تری لقا بھی ہے اک عطا مرے واسطے

مری حسرتوں کی قسم تجھے کبھی مسکرا کے بھی دیکھ لے

مرا دل الگ ہے بجھا سا کچھ ترے حسن پر بھی چمک نہیں

کبھی ایک مرکزِ زیست پر انھیں ساتھ لا کے بھی دیکھ لے

نہ مٹے گا نقشِ وفا کبھی نہ مٹے گا ہاں نہ مٹے گا یہ

کسی اور کی تو مجال کیا اسے خود مٹا کے بھی دیکھ لے

میں گلِ افسردۂ باغ ہوں مرے لب ہنسی کو بھلا چکے

تجھے اے صبا جو نہ ہو یقیں مجھے گدگدا کے بھی دیکھ لے

یہ جہان ہے اسے کیا پڑی ہے جو یہ سنے تری داستاں

تجھے بھی ہے ملا اگر یہ صلۂ غمِ دل سنا کے بھی دیکھ لے

ہر اک خوابِ تمنا نقشِ باطل ہوتا جاتا ہے — ترا ارماں ہی اب ارماں کا حاصل ہوتا جاتا ہے

یہ ربطِ عشق خود اک حدِ فاصل ہوتا جاتا ہے — جو پردہ اٹھتا جاتا ہے وہ حائل ہوتا جاتا ہے

خبر ہے حسنِ بے پروا کو جرأت بن چلی ارماں — نظر کی آڑ لیکر سامنے دل ہوتا جاتا ہے

نظر آنے لگا ہے شیخ کو ہر جا وہی جلوہ — یہ اب کافر کہے جانے کے قابل ہوتا جاتا ہے

نہیں لاتا ہے ظرفِ حسن تابِ عاشقی شاید — جسے جتنا ہی چاہا وہ اور قاتل ہوتا جاتا ہے

ہر اک آنسو میں اک خوشبو ہر اک نالے میں اک نغمہ — یہ مجھ سے چھپ کے مجھ میں کون شامل ہوتا جاتا ہے

وہ چپ ہیں اور میں بھی چپ مگر دنیا کو کیا کہیے — ہمارا تذکرہ محفل بہ محفل ہوتا جاتا ہے

کسی سے عرضِ دل کرنا جو اک دنیا کو آساں ہے
نہ جانے یہ بھی کیوں مُلّاؔ کو مشکل ہوتا جاتا ہے

جھجک اظہارِ ارماں کی بہ آسانی نہیں جاتی
خود اپنے شوق کی دل سے پشیمانی نہیں جاتی

تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اُڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی

افق پر نور بہہ جاتا ہے سورج ڈوبنے پر بھی
کہ بجھ کر دل بھی نظروں کی درخشانی نہیں جاتی

سوئے دل آ کے وہ چشمِ کرم بھی کیا بنا لے گی
شعاعِ مہر سے صحرا کی ویرانی نہیں جاتی

کسی کے لطفِ بے پایاں نے یوں سوئے دل دیکھا
کہ اب ناکردہ جرموں کی پشیمانی نہیں جاتی

یہ بزمِ دیر و کعبہ ہے نہیں کچھ صحنِ میخانہ
ذرا آواز گونجی اور پہچانی نہیں جاتی

نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہو
قیامت تک پھر اُس دل کی پریشانی نہیں جاتی

نظر جھوٹی شباب اندھا ہے وہ اک نقشِ فانی پر
حقیقت ہو تو ہو لیکن ابھی مانی نہیں جاتی

نہ پوچھو تجرباتِ زندگانی چوٹ لگتی ہے
نظر اب دوست اور دشمن کی پہچانی نہیں جاتی

نہ سمجھو ضبطِ گریہ سے خطا پر میں نہیں نادم
کہ آنسو پونچھ لینے سے پشیمانی نہیں جاتی

صدائے جنگ ہر جانب سے آتی ہے مگر مُلّاؔ
تری اب تک وہ خواب آور غزل خوانی نہیں جاتی

تم مجھے بھول جاؤ گے

رہ نہ سکے گا عمر بھر آج کا جوشِ اضطراب آرزوؤں میں آئے گا کوئی ضرور انقلاب
پھر کوئی دوست ڈھونڈ ہی لے گی نگاہِ انتخاب زیست ہے زیست، دل ہے دل اور سنا ہے پھر شباب

عہدِ وفا ہے ایک خواب
تم مجھے بھول جاؤ گے

جس کی تجلیوں سے تھی محفلِ دوش حشر خیز جس کے تبسموں سے تھا سازِ حیات نغمہ ریز
جس کے نفس نفس سے تھی بزمِ امید مشک بیز رکھ کے کبھو جگر پہ ہاتھ آج بھی ہے وہی عزیز

وقت ہے کچھ عجیب چیز
تم مجھے بھول جاؤ گے

رسمِ جہاں ہے انقلاب دہر کا نام کائنات دم کوئی لے سکے کہیں اتنا سکوں بھی ہے حیات
آرزوؤں کی دل میں ہے ایک سجی ہوئی برات ایک نگاہ ایک امنگ ایک امنگ ایک رات

ہستیٔ عشق بے ثبات
تم مجھے بھول جاؤ گے

کوئی کسی کی یاد میں حشر تلک جیا نہیں تیری نظر کی چوٹ سی کوئی کبھی بچا نہیں
بن کے کھنڈر کونسا داغِ جگر اڑا نہیں سنگِ لحد کو توڑ کر سبزہ کہاں اگا نہیں

غم کوئی لا دوا نہیں
تم مجھے بھول جاؤ گے

پھر سے نگار خانۂ شوق کو تم سجاؤ گے پھر کسی بت کے واسطے فرشِ نظر بچھاؤ گے
آج کی بات کو کبھی خواب میں بھی نہ لاؤ گے نام مرا اگر کوئی لے گا تو مسکراؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے

"تم"

سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم

تمھیں خیال کی رعنائیوں میں دیکھا ہے — تمھیں امید کی تنہائیوں میں دیکھا ہے
تمھیں کو روپ کی گہرائیوں میں دیکھا ہے — جدھر بھی آنکھ اُٹھی ہے فروغِ بام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم

ہر اک امید کا میری تمھیں ہو گہوارہ — تمھیں ہو جیسے ہر اک درد کا مرے چارہ
تمھیں پہ آکے ٹھہرتی ہے چشمِ آوارہ — ہر ابتداے تمنا کا اختتام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم

میں کون، اک گلِ افسردہ و دلِ ناشاد — تم ایک بزم کی زینت تم اک چمن کی مراد
کہاں تم اور کہاں مجھ سا زندگی برباد — مرے نصیب کی جس میں نہیں وہ جام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم

اُفقِ حیات کا پھر بھی تمھیں سے ہے زریں — ہر ایک خوابِ تصور تمھیں سے ہے رنگیں

تمھاری سمت ہے دل کی نگاہِ بازپسیں
اندھیری زیست کی اک زرنگار شام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا حرزِ لب وہ نام ہو تم

کروں میں عرضِ تمنا مری مجال نہیں
سوال دل میں ہے اور جرأتِ سوال نہیں
تمھاری یاد سے غافل مگر خیال نہیں
میں کچھ کہوں نہ کہوں حاصلِ کلام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا حرزِ لب وہ نام ہو تم

خموشیوں میں ہے دمساز کون تم جو نہیں
نظر نظر کا مری راز کون تم جو نہیں
نفس نفس کی ہے آواز کون تم جو نہیں
پیامبر ہوں اگر میں مرا پیام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا حرزِ لب وہ نام ہو تم

کسی نگاہ کا جو دل غلام ہو نہ سکا
جو سر کبھی کسی چوکھٹ پہ آج تک نہ جھکا
تمھارے در پہ وہی آج ہے جبیں فرسا
تو کیا جہان کا کُلّا سے انتقام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
جو بن گیا ہے مرا حرزِ لب وہ نام ہو تم

نوح ناروی
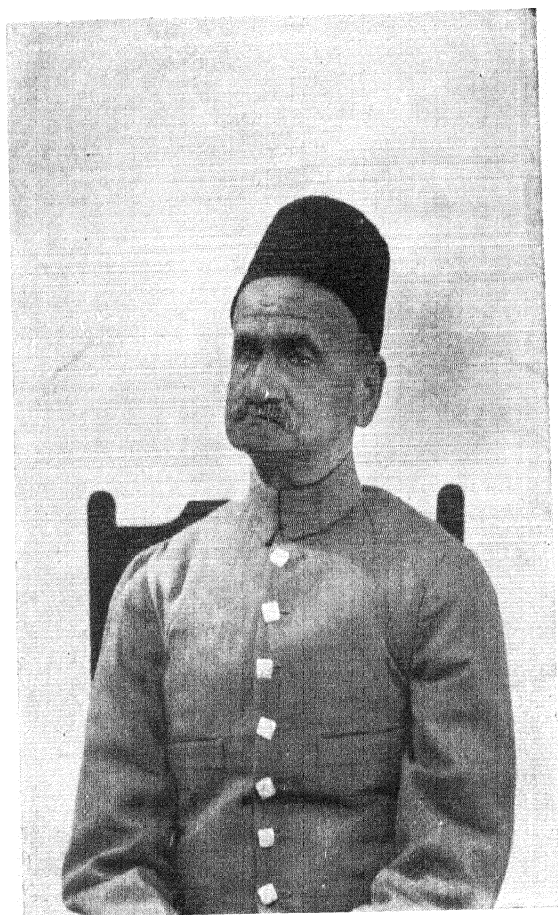
۲۲ دسمبر ۱۹۴۱ء

نوح ناروی

شبنم کے ہر آنسو میں بات نرالی ہوتی ہے — فرشِ چمن پر قطرہ ہے برگِ شجر پر موتی ہے

کھینچ کر بزمِ جہاں میں چند نالے چل دیے — رہنے والے رہ گئے جل دینے والے جل دیے

جانچ لے اے دیکھنے والے دلِ نخچیر کے — کتنے قطرے خون کے ہیں کتنے ٹکڑے تیر کے

خلق ہو کر آپ پر شیدا ہوئے — ہم اسی کے واسطے پیدا ہوئے

بیٹھ اٹھاتے ہیں یوں بارِ ساز ملنے کے — تر جیسے ہوں وہی مالک شراب خانے کے

پوچھتے ہو کیا حقیقت عاشقِ دلگیر کی — حیرت آئینے کی دیکھو خامشی تصویر کی

کم بخت کبھی جی سے گذرنے نہیں دیتی — جینے کی تمنا مجھے مرنے نہیں دیتی

ہم دیر و حرم دیکھ چکے کون و مکاں بھی — بس ایک ہی اللہ یہاں بھی ہے وہاں بھی

میرے جگر و دل میں ہے دھوم ضیا باری — ارمان کا انگارا امید کی چنگاری

طاری ہے جوش میں مٹی میں ساری آبرو میری — نکل جا اب مرے دل سے نہیں میں تیرا نہ تو میری

اس طرح دادِ حسن دی میں نے — دیکھ کر اُن کو آہ کی میں نے

ساقی جو دل سے چاہے تو آئے وہ زمانہ — ہر شخص ہو شرابی ہر گھر شراب خانہ

فتنے دبے رہے تھے جتنے پڑے ہوئے — بیٹھے کہیں جو تم تو وہ سب اُٹھ کھڑے ہوئے

بہکانے والے بہکا ہیں شوق ہے اکثر ہم کو تم کو — آنا جانا ملنا جلنا کھل کر صحبت کرنا ہم کو تم کو

مقام رام پور ۳ نومبر ۱۹۴۱ نوح ناروی

نوح ناروی

سرگزشت

محمد نوح نام، نوحؔ تخلص، وطن نارہ ضلعِ الہ آباد، تاریخِ ولادت یکم شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸ دسمبر ۱۸۷۹ء، اور مقامِ ولادت بھوانی پور تحصیلِ سلون ضلع رائے بریلی ہے۔

اُردو کی ابتدائی تعلیم حافظ قدرت علی، مولوی یوسف علی ناروی اور حاجی عبد الرحمٰن جائسی سے اور عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم میر نجف علی سے حاصل کی۔

شوقِ شعر گوئی بھی اِسی دوران میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں میر موصوف سے اصلاح لی، پھر امیر مینائی سے اور چند غزلوں میں جلالؔ لکھنوی سے مشورہ کیا، اور آخر میں حضرتِ داغؔ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ ابھی اصلاح لیتے ہوئے دو برس بھی نہ ہوئے تھے کہ اُستاد کے شوقِ قدمبوسی نے گدگدایا اور اپنے عزیزوں سے چھپ کر حیدر آباد دکن پہنچے۔ اِن کو دیکھ کر حضرتِ داغؔ نے فرمایا کہ تمھارا کلام دیکھ کر ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ نوحؔ، حضرتِ نوح کے ہم عمر ہوں گے، اگر تم تو بہت کم عمر ہو۔ کچھ عرصے کے بعد اپنے وطن واپس چلے آتے۔ ایک بار

اُستاد موصوف نے خود بھی بلایا تھا۔

نوحؔ کا درمیانی قد، گول چہرہ، اور گندمی رنگ ہے، تندرستی بھی اچھی رہتی ہے۔ معقول زمینداری کے مالک ہیں، اس لیے شبانہ روز شعر و شاعری اور اصلاحِ سخن میں مشغول رہتے ہیں۔ گفتگو میں ظرافت پائی جاتی ہے۔ طرزِ غزل خوانی بھی خوش آیند ہے۔ حافظہ بہت اچھا ہے، حضرتِ داغؔ کا بہت سا کلام اور لطیفے از بر ہیں کوئی جملہ اور فقرہ لطافت سے خالی نہیں ہوتا۔ حقّے کا بہت شوق ہے۔ انگریزی لباس سے پرہیز کرتے ہیں، اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں، مگر کبوتر بازی کا شوق بہت ہے۔

حضرتِ داغؔ کے جانشین شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری از اول تا آخر عاشقانہ ہے اور اسی کو اہمیّت دیتے ہیں۔

ہندی اور سنسکرت کے گراں الفاظ استعمال نہیں کرتے، البتہ وسعتِ زبان کے لیے نئے جملے، جدید فقرے، اور خوبصورت الفاظ کا استعمال مستحسن تصور کرتے ہیں۔

ردیف و قافیہ کی پابندی سے اشعار کہتے ہیں۔ لیکن شعر کے لیے ردیف سے زیادہ قافیے کو ضروری جانتے ہیں۔

غزل میں داغؔ، اور نظم میں اکبرؔ الہ آبادی، اور حالیؔ کو استاد مانتے ہیں۔

اِن کے چند پسندیدہ اشعار حسبِ ذیل ہیں:۔

داغؔ

سب لوگ جدھر تم ہو اُدھر دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

داغ
جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

ذوق
جس جگہ بیٹھے ہیں با دیدۂ نم اُٹھے ہیں
آج کس شخص کا مُنہ دیکھ کے ہم اُٹھے ہیں

غالب
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

اکبر
مایوس ہوں باغِ عالم میں امید سے یاری چھوٹ گئی
جس پیڑ کو سینچا سوکھ گیا، جس شاخ کو باندھا ٹوٹ گئی

〃
وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

[2] دو دیوان سفینۂ نوح اور طوفانِ نوح طبع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ تیسرا دیوان اعجازِ نوح ابھی نہیں چھپا ہے۔

انتخابِ کلام

شکریہ میزبان زباں پر آئے — فرماتے ہوئے یہ سب سخن ور آئے
طوفان کشش کا آج ایسا اُٹھا — چل کر نہیں آئے نوح بہ کر آئے

فصیح الملک کی تقلید کرنے کو ضرور آئے — اُنھیں کی پیری میں چلتے پھرتے اتنی دور آئے
غرض اے نوح اس تمہید سے اپنا یہ مطلب ہے — جنابِ داغ بھی آتے تھے، ہم بھی رام پور آئے

گردوں کانپا، تھرائی زمیں، چین اُن بن آئی مشکل سے
وہ آہ قیامت تھی شاید، نکلی جو مرے ٹوٹے دل سے
تم دل میں چبھو کر تیر اپنا، کیوں کھینچتے ہو میرے دل سے
دو بچھڑے ملے اک مدت کے، اب ساتھ چھٹے گا مشکل سے
آدابِ محبت سہل نہیں، آئیں گی یہ باتیں مشکل سے
بہتر ہے کہ تم تبدیل کرو اپنے دل کو میرے دل سے
مطلب تھا یہی جاتے ہو کہاں، ہیلو گے کہیں تم مشکل سے
جنت نے ہمیں آوازیں دیں، نکلے جو ہم اُنکی محفل سے
جم کر جو رہے تو خاک رہے، رہتے کا نتیجہ خاک نہ تھا
خوبی ہے یہی ارمانوں کی، آئیں دل میں نکلیں دل سے

یہ سوچ سمجھ لو تم پہلے پھر اپنی نظر کو گردش دو
پیوست رگِ جاں میں جو ہوا نکلا ہے وہ ناوک مشکل سے

دریائے محبت میں ظاہر موجوں کی ہمدردی نہ ہوئی
جب ڈوب رہی تھی کشتیٔ دل ، کچھ خاک اڑی تھی ساحل سے

مشتاقِ شہادت کا ارماں موقوف تھا اتنے جھگڑوں پر
گردن نے ملایا خنجر سے، خنجر نے ملایا قاتل سے

مجبورِ غمِ الفت نے کیا، حسرت نے کیا، قسمت نے کیا
اب اِس کو نہ پوچھے مجھ سے کوئی دیتا ہوں انھیں دل کس دل سے

دنیا میں مجھے راحت نہ ملی، ممکن ہے عدم میں مل جائے
جاتا ہوں اُسی منزل کی طرف آیا تھا میں جس منزل سے

جلووں کا سماں تھا ایک طرف آہوں کا دھواں تھا ایک طرف
مجنوں نے یہ دیکھا محمل میں، لیلا نے یہ دیکھا محمل سے

ہم کیوں کہیں ہم کو کیا مطلب روداد مصائب وہ پوچھیں
اُجڑے گھر کی، ٹوٹے دل کی، اُجڑے گھر سے ٹوٹے دل سے

اک دردِ جگر کی دو شکلیں دل دینے پہ معلوم ہوئیں
بڑھتا ہے بہت آسانی سے گھٹتا ہے نہایت مشکل سے

سو فتنے اُٹھے سو حشر اُٹھے اُٹھنے کے لیے کیا کچھ نہ اُٹھا
اب ہم کو یہ سننا باقی ہے اُٹھ جاؤ ہماری محفل سے

اے نوح مری کشتی کو ذرا بچنے کا طریقہ سمجھا دو
طوفان اٹھا کر دریا میں جاتے ہو کہاں تم ساحل سے

دل ہماری طرف سے صاف کرو — جو ہوا سو ہوا معاف کرو
مجھ سے کہتی ہے اس کی شانِ کرم — تم گناہوں کا اعتراف کرو
حسن اُن کو یہ رائے دیتا ہے — کام امید کے خلاف کرو
حضرتِ دل یہی ہے دیر و حرم — خانۂ یار کا طواف کرو
طورِ سینا کی سمت جائیں کلیم
نوحؔ تم سیرِ کوہِ قاف کرو

میرے جینے کا طور کچھ بھی نہیں — سانس چلتی ہے اور کچھ بھی نہیں
دل لگا کر پھنسے ہم آفت میں — بات اتنی ہے اور کچھ بھی نہیں
آپ ہیں آپ، آپ سب کچھ ہیں — اور میں اور، اور کچھ بھی نہیں
ہم اگر ہیں تو جھیل ڈالیں گے — دل اگر ہے تو جور کچھ بھی نہیں
شعر لکھتے ہیں شعر پڑھتے ہیں
نوحؔ میں وصف اور کچھ بھی نہیں

یہ مطلب ہے کہ مضطر ہی رہوں میں بزمِ قاتل میں
تڑپنا لوٹنا داخل ہوا، آدابِ محفل میں
اثر کچھ آپ نے دیکھا ہمارے جذبِ کامل کا
اُدھر چھوٹے کماں سے اور اِدھر تیر آ گئے دل میں

الٰہی کس سے پوچھیں حال ہم گورِ غریباں کا
کہ سارے اہلِ محفل چپ ہیں اس خاموش محفل میں

ادھر آکر ذرا آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والے
وہ لٹکا تو بتا دے جس سے دل ہم ڈالدیں دل میں

بدل دے اس طرح اے چرخ حسن و عشق کا منظر
پسِ محمل ہو لیلیٰ قیس ہو لیلےٰ کے محمل میں

بندھے شرطِ وفا کیوں کر نبھے رسمِ وفا کیوں کر
یہاں کچھ اور ہے دل میں وہاں کچھ اور ہے دل میں

ہمارے دل کی دنیا رہ گئی زیر و زبر ہو کر
قیامت ڈھا گیا زانو بدلنا اُن کا محفل میں

یہ کیا اندھیر ہے، کیسا غضب ہے، کیا تماشا ہے
مٹاؤ بھی اُسی دل کو رہو بھی تم اُسی دل میں

تماشا ہم بھی دیکھیں ڈوب کر بحرِ محبت کا
اپاہج کی طرح بیٹھے ہیں کیا آغوشِ ساحل میں

طریقہ اس سے آساں اور کیا ہے گھر بنانے کا
مرے آغوش میں آکر جگہ کر لیجے دل میں

بڑھا اے نوحؔ جب طوفان دریائے حوادث کا
تو غوطے ورطِ غم نے دیدیے افکارِ ساحل میں

تاب نہیں سکوں نہیں دل نہیں اب جگر نہیں
اپنی نظر کدھر اُٹھے کوئی ادھر اُدھر نہیں
روز و شب اُٹھتے بیٹھتے اُن کی زباں پہ نہیں
کوئی نہیں کی حد نہیں، شام نہیں سحر نہیں
کوئی یہاں سے چل دیا رونقِ بام و در نہیں
دیکھ رہا ہوں گھر کو میں گھر ہے مگر وہ گھر نہیں
اتنی خبر تو ہے ضرور لے گئے دل وہ چھین کر
کیا ہوا اُس کا پھر مآل اس کی مجھے خبر نہیں
کیوں وہ اِدھر اُدھر پھرے کیوں یہ حدودِ بے بصر
تیری نظر تو ہے نظر میری نظر نظر نہیں
مجھ سے بگڑ کر اپنے گھر جائیے خیر جائیے
آپ نے یہ سمجھ لیا آہ میں کچھ اثر نہیں
دیر کو ہم گھٹائیں کیوں کعبہ کو ہم بڑھائیں کیوں
کیا ہے خدا کا گھر یہی کیا وہ خدا کا گھر نہیں
پردے سے باہر آئیے، رخ سے نقاب اُٹھائیے
تابِ جمال لا سکے اتنی مری نظر نہیں
مجھ کو خیالِ روز و شب خاک رہے مزار میں
ایسی جگہ ہوں جس جگہ شام نہیں سحر نہیں

تیغ کہو، سناں کہو، قہر کہو، بلا کہو
اہلِ نظر کی رائے میں اُن کی نظر، نظر نہیں

ڈر گئے اہلِ انجمن تیر جو آپ کا چلا
اِس نے کہا اِدھر نہیں اُس نے کہا اُدھر نہیں

روز کے غم نے اِس طرح خوگرِ ضبطِ غم کیا
درد ہمارے دل میں ہے شکوہ زباں پر نہیں

پوچھتے ہیں وہ حالِ دل طولِ سخن سے فائدہ
سو کی یہ ایک بات ہے کہہ دوں مجھے خبر نہیں

اُن میں کچھ اور بات تھی اِن میں کچھ اور بات ہے
حضرتِ نوحؑ کا گماں حضرتِ نوح پر نہیں

نالہ سا آہیں مری اوجِ مراتب پا گئیں
دل سے نکلیں لب تک آئیں آسماں پر چھا گئیں

نزع میں دل سے نکل کر جو زباں پر آ گئیں
وہ صدائیں کچھ نہ تھیں لیکن قیامت ڈھا گئیں

اے نگاہِ دلنواز اُٹھ اور میرے دل کو دیکھ
جتنی نکلی تھیں تمنائیں پھر اُتنی چھا گئیں

میں امیدِ غنچہ و گل اب کروں تو کیا کروں
کونپلیں پھوٹی تھیں جن شاخوں میں وہ مرجھا گئیں

خانۂ دل میں یہ عالم آرزوؤں کا رہا
چند نکلیں، چند ٹھہریں، کچھ گئیں، کچھ آگئیں
سب سے جانا ایک اپنا ہم وطن گم ہوگیا
غم اگر نکلا تو دل کی حسرتیں گھبرا گئیں
صورتِ سیلاب مضموں کا اثر بڑھتا گیا
نوحِ طوفانی کی غزلیں خوب شہرت پا گئیں

وحشت کلکتوی

وحشت

غزل

تری بزم ناز میں تھا جو دل کبھی شمعِ روشنِ آرزو
ستم زمانہ سے بن گیا وہی آج مدفنِ آرزو

مرا دل ازل کا فسردہ ہے مجھے شوق سے سروکار کیا
نہ ہوائے میکدۂ ہوس نہ دماغِ گلشنِ آرزو

کبھی یک بیک مری خستگی ہوئی دور ساری شکستگی
کبھی آئی جھولے سوئے دل جو نسیمِ گلشنِ آرزو

نہ خدنگِ ناز نے رُخ کیا کبھی جانبِ دلِ بے نوا
نہ گلِ مراد سے پُر ہوا کبھی اپنا دامنِ آرزو

مجھے یاد آتا ہے اپنا دل کہ بہار جس سے تھی منفعل
وہ نہالِ تازۂ رنگ و بو وہ چراغِ روشنِ آرزو

نہ کوئی ہوس ہے نہ ولولہ یہ ہے حالِ وحشتِ خستہ کا
ہے فریب خوردۂ آرزو وہ بنا ہے دشمنِ آرزو

وحشت کلکتوی

سرگزشت

رضا علی نام، وحشت تخلص، ۱۸ر نومبر ۱۸۸۱ء تاریخ پیدائش، اور وطن کلکتہ ہے۔

اُردو فارسی کی تعلیم کے بعد انگریزی سے واقفیت حاصل کی۔ موزونیتِ طبع خداداد تھی، سولہ سال کی عمر سے طبیعت کو شعر و سخن سے لگاؤ پیدا ہوگیا۔ مولوی ابوالقاسم محمد شمس، خلفِ مولوی عبدالغفور خاں بہادر نساخ سے تلمذ ہے، جو حضرتِ داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔

مشقِ سخن ملازمت کے دوران میں بدستور جاری رہی۔ ایک دیوان ۱۹۱۰ء میں طبع ہوچکا ہے۔ اس پر مولانا حالی، علامہ شبلی اور جنابِ ظہیر دہلوی نے داد اور مبارکباد دی تھی۔

تعلیم و تدریس اور شعر و سخن حیات کے مستقل مشاغل ہیں۔ ۱۹۳۶ء تک گورنمنٹ اسلامیہ کالج کلکتہ میں پروفیسر رہے۔ فی الحال پنشن پا رہے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں سرکار سے "خان بہادر" کا خطاب بھی مل چکا ہے۔

انھیں میرزا غالب کا رنگ سب سے زیادہ پسند ہے۔

انتخابِ کلام

لطفِ نہاں سے جب جب وہ مسکرا دیے ہیں
میں نے بھی زخم دل کے اُن کو دکھا دیے ہیں

کچھ حرفِ آرزو تھا کچھ یادِ عیشِ رفتہ
جتنے تھے نقش دل میں ہم نے مٹا دیے ہیں

فرطِ غم و الم سے جب دل ہوا ہے گریاں
اُس نے عنایتوں کے دریا بہا دیے ہیں

دیکھے ہیں تیرے تیور دھوکا نہ کھائیں گے اب
اُٹھتے تھے ولولے کچھ ہم نے دبا دیے ہیں

اس دل نشیں ادا کا مطلب کبھی نہ سمجھے
جب ہم نے کچھ کہا ہے وہ مسکرا دیے ہیں

کچھ شوخ کر دیا ہے چھیڑوں سے ہم نے تم کو
کچھ حوصلے ہمارے تم نے بڑھا دیے ہیں

کیا کوئی تجھ کو دیکھے پردہ اُٹھانے والے
تو نے تجلیوں کے پردے گرا دیے ہیں

کرتا ہوں وحشت اُن سے عرضِ نیازِ پنہاں
اس کام کے طریقے دل نے بتا دیے ہیں

بہار آئی ہے اب مجھکو نکل جانا ہے گلشن سے
نگاہِ باغباں ہٹتی نہیں میرے نشیمن سے

ہمیں اے ہم نشیں تو کنجِ تنہائی میں رہنے دے
علاجِ افسردہ طبعی کا نہ ہوگا سیرِ گلشن سے

پہنچ جاتا ہے اپنا ہاتھ خود اپنے گریباں تک
وہ ہم کو دیکھ کر جب منہ چھپا لیتے ہیں دامن سے

ستم ہے آشنا بیگانگی اے باغباں تیری
ہوا خواہانِ گلشن ہی نکالے جائیں گلشن سے

نشیمن میں ہیں کیا اُن کی صورت نظر آئے
دکھائی دے رہا ہو جب قفس شاخِ نشیمن سے

محبت ہے کہ ہے عاشق فریبی کس طرح سمجھوں
مجھے تو ڈر ہی لگتا ہے برابر اُن کی چتون سے

بجز خونِ تمنا کیا نتیجہ ہے تمنا کا
بغیر از برقِ خرمن اور کیا حاصل ہے خرمن سے

قفس میں ہوں مگر اِس پر قناعت کی نہیں جاتی
خیال آتا ہے گلشن کا، پیام آتے ہیں گلشن سے

بڑھا کر شوقِ نظارہ بڑھائی حسن کی بینش
لگائے چار چاند اُس نے رخِ روشن کو چلمن سے

ترے غمزے لڑا دینگے مسلماں کو مسلماں سے
ترے عشوے بھڑا دینگے برہمن کو برہمن سے

ہوا ہے باعثِ تکلیف اب شغلِ سخن وحشت
تعلق قطع کرنا ہی پڑے گا مجھ کو اس فن سے

ہٹا نہ سایۂ گیسوے فتنہ زا سے مجھے
بلائیں گھیر لیں آ کر تری بلا سے مجھے

ترے تغافلِ صبر آزما سے ڈرتا ہوں
دگرنہ عہدِ وفا ہے تری جفا سے مجھے

نہ کام آئی کبھی اپنی کوشش و تدبیر
کوئی مراد ملی تو ملی دُعا سے مجھے

مری نگہ نے حریفوں سے کہدیا سرِ بزم
کہ کوئی روک تو لے عرضِ مدعا سے مجھے

ہزار شکر کہ جس حال میں ہوں میں خوش ہوں
نہیں شکایتِ جورِ بتاں خدا سے مجھے

نگاہیں پڑتی ہیں مجھ پر بھی اے ترے صدقے
تری نگاہ نے کیا کر دیا ہے کیا سے مجھے

میں بزمِ یار میں محوِ نشاط ہوں وحشت
نویدِ عیش ہے اُس چشمِ آشنا سے مجھے

وہ نگاہیں مہربانی پر جو مائل ہو گئیں
سچ تو یہ ہے اور بھی غارتگرِ دل ہو گئیں

میرے سوزِ دل سے ہوتی ہیں تحریکِ عشق
میری آہیں باعثِ گرمیٔ محفل ہو گئیں

جو تمنائیں کہ قاتل سے ابھی تک تھیں نہاں
کچھ نمایاں وہ بشکلِ رقصِ بسمل ہو گئیں

اُن نگاہوں سے ہمیں تھی آرزوے التفات
ملتفت ہو کر وہ برقِ خرمنِ دل ہو گئیں

وہ ادائیں جو نزاکت کی سراسر جان تھیں
اللہ اللہ کس طرح شمشیرِ قاتل ہو گئیں

تھیں تمنائیں کبھی رونق فروزِ بزمِ دل
رفتہ رفتہ محو مثلِ حرفِ باطل ہو گئیں

اس کو کہتے ہیں وفاداری کبھی چھوڑا نہ ساتھ
حسرتیں دل کی چراغِ تربتِ دل ہو گئیں

وہ نگاہوں سے مری بچتے ہیں، ڈرتے ہیں کہیں   یہ اگر ہم سے کہیں مطلب کی سائل ہو گئیں

تا بمنزل جب رسائی ہو گئی وحشت محال

دقتیں ہر ہر قدم پر مجھ کو منزل ہو گئیں

رہِ محبت میں جز محبت، مرا کوئی مدعا نہیں ہے

نظر چراتے ہو مجھ سے کیوں تم، مری کوئی التجا نہیں ہے

ہوا میں زورِ کششِ نہیں ہے، گلوں میں بوئے وفا نہیں ہے

سبھی ہیں بیگانہ اس چمن میں کوئی یہاں آشنا نہیں ہے

طریقِ الفت میں اپنی منزل کدھر ہے اس کا پتا نہیں ہے

سوائے گم کردہ راہ دل کے کوئی مرا رہنما نہیں ہے

نہ زحمتِ فکرِ چارہ سازی نہ بارِ احسانِ چارہ ساز اب

ملا ہے قسمت سے تجھ کو اے دل وہ درد جس کی دوا نہیں ہے

ادھر وہی ہے نیازمندی، اُدھر وہی شیوۂ تغافل

ہوئے ہیں بے نیاز ایسے کہ جیسے میرا خدا نہیں ہے

حریفِ اندازِ بے نیازی بنا ہوں اُس شوخ نازنیں کا

زباں پہ مدعا نہیں ہے نگاہ میں التجا نہیں ہے

وہی ہے بزمِ نیازمنداں جہاں کی ہر رسم جانفشانی

وہی ہے بازارِ دلستاناں جہاں متاعِ وفا نہیں ہے

کہاں سے ہو خواہشِ تکلم بجا ہے وحشت تری خموشی

کوئی ترا ہم نفس نہیں ہے کوئی ترا ہمنوا نہیں ہے

سوزِ غم میں نہیں پروانہ ہی قائل میرا — شمع بھی دیکھتی ہے منھ سرِ محفل میرا
محوِ حیرت ہے مرے ضبط پہ قاتل میرا — کیا سبب ہے کہ تڑپتا نہیں بسمل میرا

نہ اثر کو مرے پایا نہ غرض کو سمجھے — طرز اُڑاتے رہے گلشن میں عنادل میرا
قعرِ دریا سے تو نکلا ہوں مگر ڈرتا ہوں — ڈوب جائے نہ سفینہ لبِ ساحل میرا
زندگانی طمعِ خام میں گزری ساری — فکرِ حاصل کے سوا کچھ نہیں حاصل میرا
سختیِ راہ سے ہوتی نہیں دل کو امید — کہ گزر ہوگا کبھی تا سرِ منزل میرا

رات اُس نے جو نظر مجھ سے چُرائی وحشت
مل گیا خاک میں امید بھرا دل میرا

اسی میں عافیت ہے، زندگی کو یوں بسر کرنا — نہ فکرِ نفع میں رہنا نہ پروائے ضرر کرنا
نہیں منظور اپنے درد کی تجھ کو خبر کرنا — نہیں آتا نہ آئے میرے نالوں کو اثر کرنا
ادائے دلبری کے ساتھ اُنھیں لاکھوں ہنر آئے — مگر آیا نہ اپنے خستہ حالوں پر نظر کرنا
اِسے نیرنگ کہتے ہیں کہ اُس کافر کو آتا ہے — نئے انداز سے ایک ایک ادا کو جلوہ گر کرنا
کسی کو ظلم سے کرنا ہلاکِ شیوۂ غفلت — کسی کو دل لگی سے زخمیِ تیرِ نظر کرنا
نگاہِ ناز سے دینا کسی کو درسِ مشتاقی — کسی کو بوئے زلفِ عنبریں سے بےخبر کرنا
کبھی تو شوخیوں سے جرأت آموزِ ہوس ہونا — کبھی پھر شیوۂ تمکیں سے محرومِ نظر کرنا
اشاروں سے کبھی کھوئے ہوؤں کو ہوش میں لانا — کبھی پھر ہوش والوں کو یکایک بےخبر کرنا

کروں میں کاوشیں فکرِ سخن میں کس لیے وحشت
نہیں منظور بزمِ شعر میں عرضِ ہنر کرنا

یہ کیسی کثرتِ گل ہے یہ کیا رونق ہے گلشن کی
جگہ کاہے کو اب ہوگی یہاں میرے نشیمن کی

تماشا ہوگئی سحر آفرینی چشمِ پُرفن کی
ہوئی ہے ایک حالت بزم میں شیخ و برہمن کی

گریباں کا مرے قصہ طلب ہے چاکِ ناکامی
گلِ مقصود سے زینت ہوئی ہے کس کے دامن کی

نہ میں بیگانۂ گلشن، نہ گلشن مجھ سے بیگانہ
خدا جانے ہوئی کیا وجہ بربادی نشیمن کی

نہ ہو دستِ جنوں تو کون پُرساں ہو گریباں کا
نہ لے وحشت خبر تو سخت رسوائی ہے دامن کی

وہ حسنِ خود نما مستور ہو کر اور چمکا ہے
بنی ہے نور کی چادر یہ کیفیت ہے چلمن کی

نہ حسن اُن کا مقید ہے، نہ چشمِ شوق عاجز ہے
پھر آخر کس لیے رکھی گئی ہے آڑ چلمن کی

دلوں کا مدعا جب ایک ہے، تفریق پھر کیسی
عبادت شیخ کی جو ہے وہی پوجا برہمن کی

دکھائے ہیں غزل میں آج جوہر کچھ طبیعت کے
طلب کرتا ہوں اہلِ فن سے وحشتؔ داد میں فن کی

اشاریہ

اشخاص

۲- اقوام و فرق

۳۔ مقامات

۴- ادارے

۵۔ کتب